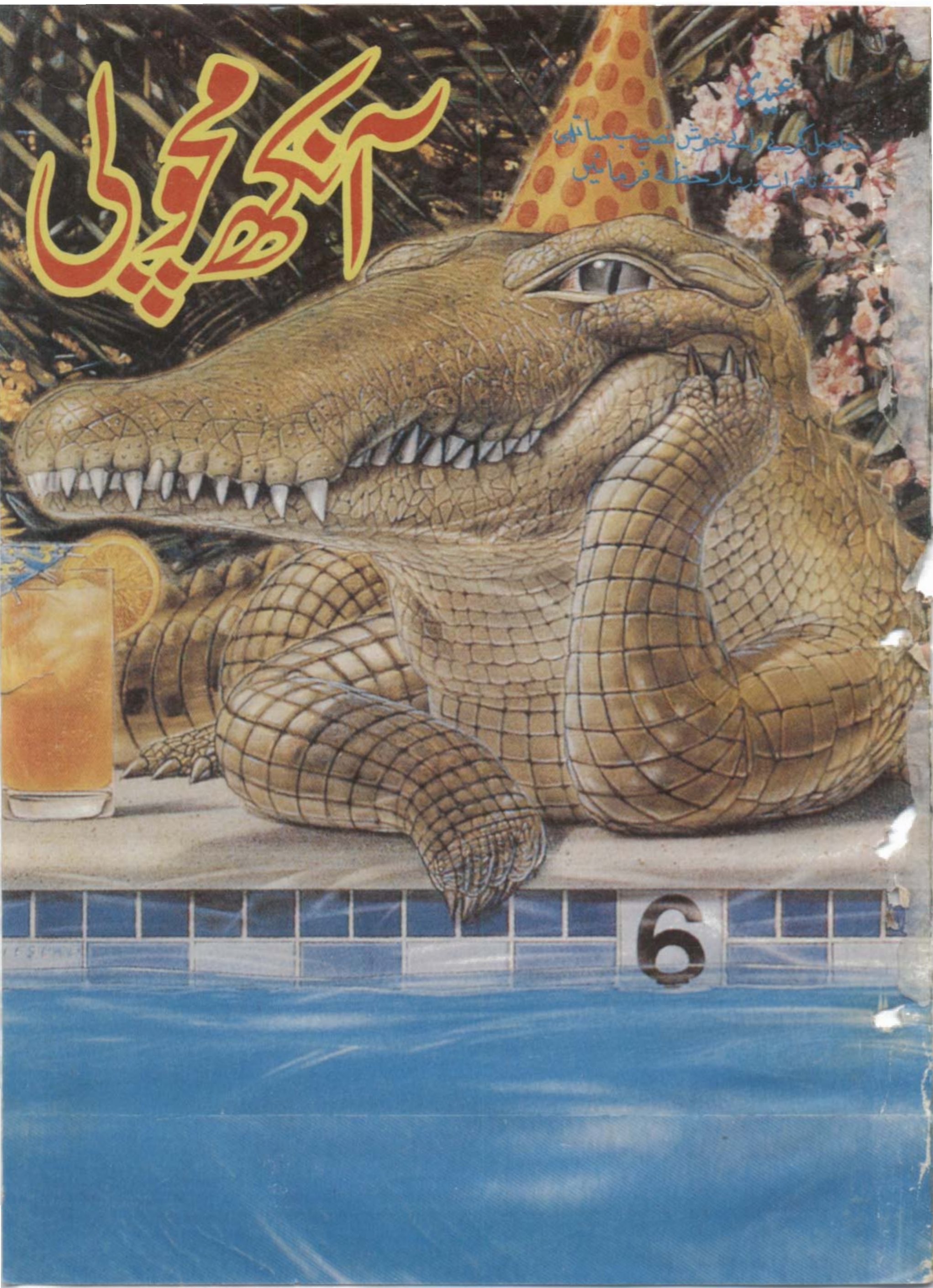
آنکھ مچولی
عیدی
حاصل کرنے والے خوش نصیب ساتھی
اپنے نام اندر ملاحظہ فرمائیں
6

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں !
ٹپال چائے
دانے دار
لیف بلینڈ
فوری تیار، زیادہ خوشبودار
گہری رنگت، یادگار لذت
ایک پیالی میں گھنٹوں تسکین
TAPAL
TAPAL TEA
DANEDAR
Leaf Blend

IBLAGH

نئی کارمینا

نظامِ ہضم کی اصلاح کے لیے زیادہ پُرتاثیر

انسان کی تن دُرستی کا زیادہ تر انحصار معدے اور جگر کی صحت مند کارکردگی پر ہے۔ اگر نظامِ ہضم درست نہ ہو تو دردِ شکم، بدہضمی، قبض، گیس، سینے کی جلن، گرانی یا بھوک کی کمی جیسی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں جس کے سبب غذا صحیح طور پر جزوِ بدن نہیں بنتی اور صحت رفتہ رفتہ متاثر ہونے لگتی ہے۔

پاکستان اور دنیا کے بہت سے ممالک میں ہمدرد کی کارمینا پیٹ کی خرابیوں کے لیے ایک مؤثر نباتی دوا کے طور پر شہرت رکھتی ہے۔ چونکہ یہ ہر گھر کی اہم ضرورت ہے اس لیے ہمدرد کی تجربہ گاہوں میں اس کی افادیت پر ہمہ وقت تحقیق و تجربات کا عمل جاری رہتا ہے۔ نئی کارمینا اسی تحقیق کا حاصل ہے۔ نئی کارمینا کو پودینے کے جوہر اور دیگر مفید و مؤثر اجزا کے اضافے سے زیادہ قوی، پُرتاثیر اور خوش ذائقہ بنا دیا گیا ہے۔

نئی کارمینا نظامِ ہضم کو بیدار کرنے، معدے اور آنتوں کے افعال کو منظم و دُرست رکھنے میں زیادہ کارگر ہے۔

بچوں بڑوں سب کے لیے مفید **نئی کارمینا** ہمیشہ گھر میں رکھیے

ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

اعلانِ اخلاق
تحقیق، رُوحِ تخلیق ہے

Adarts CAR- 4/88

۴ خصوصیات کی بنا پر
یو بی ایل کا انتخاب کیجئے
اور سہولت پانچویں خصوصیت بھی ہے

جدّت

یو بی ایل آپ کو جامع پیشہ ورانہ خدمات پیش کرتا ہے۔ ہمارے وسیع دائرۂ خدمت میں اِنفرادی بینکاری، غیر مُلکی کرنسی کے قرضے، زرعی قرضہ جات، غیر ملکی اور مقامی ہُنڈیاں، بیرونِ مُلک سے رقم کی ترسیل، اور زرِ مبادلہ کی خدمات وغیرہ شامل ہیں۔

اعتماد

یو بی ایل آپ کی سرمایہ کاری کو کامیاب بنانے کے لئے خصوصی سُوجھ بُوجھ اور مُستعدی کے ساتھ بروقت معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ جس میں آپ کے لئے اہم منڈیوں کے بارے میں قابلِ اعتماد اِطلاعات شامل ہیں۔

تجربہ

ہماری بینکاری کی خدمات ۳۰ سال کے عرصے پر پھیلے ہوئے وسیع تجربہ اور مہارت کا حاصل ہیں۔ یہ آپ کے فائدے اور سہولت کے لئے وقف ہیں۔

کارکردگی

ہماری بینکاری کا نظام عالمگیر ہے۔ ہماری ۱۶۰۰ سے زیادہ برانچوں کا جال دُنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ جن کی بدولت ہم آپ کی مؤثر اور فوری خدمت کی بہتر صلاحیت رکھتے ہیں۔

سہولت

ہمارا عملہ، دوستانہ انفرادی توجہ کے ساتھ خدمت کے لئے ہر وقت مُستعد رہتا ہے۔ اس لئے یو بی ایل سے لین دین آپ کے لئے ایک پُرمسرت تجربہ ہے۔ معیاری خدمت کی لگن اور بہترین کارکردگی باہمی طور پر پائیدار کاروباری تعلق کی مضبوط بنیاد ہے

یو بی ایل

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

— ترقی ہمارا شعار

UBL-9-90

ASIATIC

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

مدیر اعلیٰ — ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول — تجمل حسین چشتی

مشاورت — مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مدیران اعزازی — طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلس ادارت — شاہ نواز فاروقی، ساجد سعید

فون ۲۹۹۱۴۸

جلد ۵ شمارہ ۱

جولائی ۱۹۹۰ء / ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ

◉ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

◉ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

◉ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے شائع کیا۔

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

قیمت ۱۰ روپے ، ۷ درہم ، ۷ ریال

زرِ سالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

دِل دِل پاکستان

آنکھ مچولی سالگرہ جولائی ۱۹۹۰ء کے بجائے

پاکستان کی سالگرہ کے موقع پر

اگست ۱۹۹۰ء میں شائع ہو رہا ہے

- وطن کی محبّت میں ڈوبے ہوئے قلم کی دلگداز تحریریں
- سوہنی دھرتی کی محبّت سے سرشار نظمیں، گیت اور نغمے
- آزادی کی جوت جگانے والی کہانیاں
- دل و نظر کو بھا جانے والی تصاویر

حرف حرف پاکستان **** لفظ لفظ پاکستان

دِل دِل پاکستان نمبر کے ساتھ ایک بہت ہی خاص **تحفہ مفت**

اس سے قبل کہ دِل دِل پاکستان نمبر مارکیٹ میں باقی نہ رہے اپنا رسالہ پہلی فرصت میں خریدنے کا اہتمام ابھی سے کر لیجئے

مرغِ تحریرنما

۸	بازگشت	
۱۱	ڈاکیہ ڈاک لایا	......
۱۵	حضرت عمر عبدالعزیزؒ	عبیداللہ اظہر
۲۱	چہرے سے میں خوفناک ہوں	سلمیٰ سلیم
۲۳	عیدالاضحیٰ (نظم)	امان اللہ شوکت نیر
۲۵	ایک اور دھماکہ	سطوت شادمان
۲۹	ہمیں کیوں ضائع کیا جارہا ہے	طاہر مسعود
۳۹	کھٹ مٹھے	......
۴۳	پیامِ سحر (نظم)	نذیر پارس
۴۴	چیونٹی کو بھی حقیر نہ جانو	رفعت ہمایوں
۴۸	کراچی کا نام کراچی کیسے پڑا	سیّد نظر زیدی
۵۱	فطرت کی دنیا	شین فاروقی
۵۵	دلدل	حمید کاشمیری
۶۵	سائنس انکوائری	ایاز محمود
۶۹	بے اصولی (نظم)	شاہنواز فاروقی
۷۱	ہوائیوں کہ......	......
۷۵	زمین کی کہانی	ساجد سعید
۷۹	چوکیدار، (نظم)	شبیر بیگ ناز
۸۱	چمکدار ستارہ	بن یامین
۸۷	ایک تبادلہ جس نے	شاہنواز فاروقی
۹۳	غزل پزل	اسامہ بن سلیم
۹۷	ماچس کی ڈبیہ	منیر احمد راشد
۱۰۳	میں نے تنِ تنہا....	ارشد شاہین
۱۰۹	قصّہ ایک موجد کا	شاہد محمود عابد
۱۱۳	سپاہی اور جن	سید شاہد میر
۱۱۹	وقاص کو غصّہ کیوں آتا ہے؟	کاشان جعفری
۱۲۷	ننھّی نگارشات	
۱۳۹	سالگرہ کے ساتھی	
۱۴۲	امّی ابّو کا صفحہ	ہما سلیم

مور اور کونج

ایک مور اور کونج کی ملاقات ہو گئی مور نے کونج سے کہا کہ دیکھو میرے پر کتنے خوبصورت ہیں ایسے پر کسی اور پرندے کے کہاں۔ لوگ میرے پر دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اس کے رنگ اور ڈیزائن کو تو دیکھو۔ واہ واہ۔

اس طرح مور اپنے پروں کی تعریف کرتا چلا جارہا تھا۔ کیونکہ اسے اپنے پروں پر غرور تھا۔
کونج ہنس دیا اور کہنے لگا۔ بیشک تمہارے پر بہت خوبصورت ہیں لیکن کس کام کے؟ وہ صرف بچوں کو خوش کر سکتے ہیں۔ تمہاری دم اتنی بڑی ہے کہ تم ان پروں سے اڑ نہیں سکتے۔ شکاری تمہارا شکار آسانی سے کر لیتے ہیں۔ یہ کہہ کر کونج اڑ گیا اور اڑتے ہوئے کہنے لگا میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ مور کو انتہائی شرمندگی ہوئی۔ وہ تو اڑ نہیں سکتا تھا۔

وہ لوگ جو دکھاوا پسند ہوتے ہیں، وہ مور کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی خوبیوں پر مغرور ہوتے ہیں جو کہ اچھی بات نہیں۔

سحر تاج احمد

اداریہ

ماہ رواں کی پہلی بات

"آنکھ مچولی" نے جب بھی آپ سے وعدہ کیا ہے پورا کیا ہے۔ اس بار حالات نے بدقسمتی سے ہمیں وعدہ خلافی پر مجبور کر دیا۔ کراچی کے ہنگاموں نے شہر کی زندگی تلپٹ کر دی، سارا نظام زندگی معطل ہو گیا۔ ان حالات میں "دل دل پاکستان" لانا ممکن نہ ہو سکا۔ جس کے لئے ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ جب یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہو گا تو اسے خاص شمارہ نہ پاکر آپ کو ذرا سی مایوسی ہو گی۔ اور ایسا ہونا بھی چاہئے۔

ہماری قومی زندگی کا بھی المیہ یہی ہے کہ ہمارے رہنماؤں نے ہم سے جب جب وعدہ کیا، اسے پورا کرنا بھول گئے...... انہوں نے، وعدہ کیا تھا پاکستان ایک اسلامی جمہوری ملک ہو گا...... اور یہاں امن و انصاف کے چراغ جلیں گے...... انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان مسلمانوں کی پناہ گاہ ثابت ہو گا جہاں سب سُکھ چین کی زندگی بسر کریں گے اور اس مملکت خداداد کو ہم دنیا بھر کے لئے جیتی جاگتی مثال بنا دیں گے۔ لیکن یہ سارے وعدے محض وعدۂ فردا ہی رہے۔

ہم نئی نسل کے لوگ ہیں جنہوں نے ہوش سنبھالتے ہی وعدوں کو ٹوٹتے دیکھا ہے۔ اس لئے ہم سے زیادہ کون واقف ہو گا کہ سچا وعدہ ہی اچھا وعدہ ہوتا ہے اور جو ایسا نہیں ہوتا وہ محض جھوٹ اور دھوکا ہوتا ہے۔ "دل دل پاکستان" لانے کا مقصد بھی اسی وعدے کی یاد دھانی ہے جو ہمارے بزرگوں نے ہم سے کیا تھا اس کے علاوہ ایک مقصد یہ بھی دیکھنا ہے کہ گزشتہ چالیس چوالیس سال میں ہم نے ترقی کا کتنا سفر طے کیا، کیسی شخصیات پیدا کیں اور کن کن شعبوں میں نام کمایا، ہم میں ایک خرابی یہ بھی تو ہے کہ ہم ہر وقت خود کو لعن طعن کرتے رہتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں جیسے دنیا میں ہم سے زیادہ بُری اور کمزور قوم کوئی ہے ہی نہیں۔ اس رویئے سے جو مایوسی ذہنوں میں جنم لیتی ہے وہ ترقی کے راستے کا سب سے بڑا پتھر ثابت ہوتی ہے۔ ہمیں اس رکاوٹ کو بھی دور کرنا ہے اور یہ دکھانا ہے کہ ہم جب نیک نیت ہو جائیں اور آپس میں اتحاد پیدا کر لیں تو ناممکن کو ممکن کر دکھاتے ہیں۔ لیکن یہ خود اعتمادی ہم میں اس وقت آئے گی جب ہم پہلے اپنا احتساب کریں اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ خدا کی کیسی نعمتیں ہمیں ایک ملک پاکستان کی صورت میں ملیں اور ہم نے ان نعمتوں کا شکر کہاں تک ادا کیا۔

یہ اور اسی طرح کی ڈھیروں باتیں ہیں جن کا احاطہ ہم نے "دل دل پاکستان" میں کیا ہے۔ ہمارا یہ شمارہ انشاء اللہ بچوں کی صحافت میں ایک دستاویز ثابت ہو گا۔ ایک ایسا آئینہ ہو گا جس میں وہ سب کچھ دکھائی دے گا جسے ہم دیکھنا نہیں چاہتے یا دیکھ کر بھی انجان بن جاتے ہیں۔

"دل دل پاکستان" اب یوم آزادی کے موقع پر شائع ہو رہا ہے شاید اس کی اشاعت کا صحیح وقت بھی یہی تھا۔ اس معمولی سی تاخیر سے آپ کو فائدہ یہ ہوا کہ اب آپ اسے اور زیادہ بہتر پائیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم اپنے پیارے ملک کو مستقبل میں آج سے زیادہ خوبصورت اور ترقی یافتہ دیکھیں گے...... انشاءاللہ

آپ کا دوست ظفر محمود شیخ

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے
کتنے سستے کتنے پیارے

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت اور تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ

۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف **۱۵۰** روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

زرِ سالانہ کی رقم د ے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوادیں

آنکھ مچولی بیرونِ ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مبلغ ۳۰۰/- روپے

سالانہ ممبر شپ آنکھ مچولی ۱۱۲۔ ڈی سائٹ کراچی

کوپن صفحہ نمبر ۱۴۱ پر دیکھئے

ڈاکیا ڈاک لایا

عمران خان ، ملتان : پیارے انکل ! معاشرے میں قتل و غارتگری کا بازار گرم ہے اور "حق اسکواڈ" کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ اگر وہ آپ کو کہیں مل جائیں تو ان سے کہیئے گا کہ "اس کٹھن وقت میں وہی ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں"۔

○ ...... حق اسکواڈ، تک ہم نے آپ کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم سماجی برائیوں کے خلاف تو جہاد کر سکتے ہیں لیکن کلاشن کوف نہیں چلا سکتے۔ دہشت گردوں کا مقابلہ تو حکومت ہی بہتر طریقے سے کر سکتی ہے۔

محمود اصغر ، فتح پور شریف : بھائی جان ! میں ہر مہینے اپنے گاؤں سے ۱۸ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے آنکھ مچولی خریدنے شہر جاتا ہوں چونکہ ہمارے گاؤں کے اکثر لوگ غریب ہیں اس لئے میرے دوست رسالہ مجھ سے لے کر پڑھتے ہیں ...... آپ کرکٹ نمبر ، کیوں نہیں شائع کرتے ؟

○ ...... عزیز بھائی ! مطالعے سے آپ کی دلچسپی قابلِ تعریف ہے۔ غربت کو صرف تعلیم ہی کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے اپنے گاؤں میں تعلیم عام کرنے کی کوشش کیجیئے۔ آنکھ مچولی دو ایک سال پہلے "کرکٹ اسپیشل" شائع کر چکا ہے۔

لبنیٰ ارشاد قریشی ، ڈیرہ اسماعیل خان : میرا مشورہ ہے کہ آپ رسالے میں "آرٹ گیلری" کا سلسلہ شروع کر دیں۔ امید ہے بچّے اسے پسند کریں گے۔

○ ...... تجویز اچھی ہے اور عنوان بھی اچھا ہے۔ بہت شکریہ۔ اس پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

... میں ایف ایس سی سال دوم کا طالب علم ہوں۔ پھر بھی بچّہ بن کر آنکھ مچولی کھیلتا ہوں۔ میرے دوست میرے ہاتھوں میں رسالہ دیکھ کر مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن سرورق دیکھ کر مجھ سے ادھار لے جاتے ہیں۔ آپ کے پرچے کا گہرا مطالعہ کر کے اس پر تنقید کے قابل ہو سکوں گا۔ فی الحال تعریف پر اکتفا کرتا ہوں۔

○ ...... آنکھ مچولی کے نام سے یہ سمجھنا کہ یہ دودھ پیتے بچوں کا رسالہ ہے درست نہیں ہے۔ اس کے پڑھنے والوں میں اسکول سے لے کر کالج اور یونیورسٹی تک کے طلباء و طالبات شامل ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ جو پہلے ہنستے ہیں وہی اس کے دیوانے بھی ہو جاتے ہیں۔

سعدیہ چوہدری ، سرگودھا : میں آپ کی "سگریٹ چھڑاؤ" تحریک سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ جس طرح آپ نے نئی نسل کو سگریٹ کے نقصانات سے خبردار کیا ہے اسی طرح آج کے حالات کے بارے میں بتائیں۔ انہیں آپ چھوٹے چھوٹے کتابچے دیں جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ ان حالات میں "ہم" کیا کر سکتے ہیں۔

○ ...... آپ کا دردمندانہ خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ آپ کی تجویز بھی اچھی ہے۔ اسی طرح کی کوششیں ہم پہلے ہی رسالے میں کرتے رہتے ہیں۔ "دل دل پاکستان" بھی ہم اس لئے شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں آپ کے تعاون کی بھی ضرورت ہے۔

عثمان عنبر، قاضی آباد ضلع دیر : آپ نے میرے خط کو ردّی کی ٹوکری کی غذا بنایا، مضمون بھی شائع نہیں کیا۔ مضمون تو خیر غیر معیاری ہو گا، کیا خط میں بھی معیاری ہونے کی قید ہے یا کوئی فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ خدا کرے آپ کی ردّی کی ٹوکری پھولے پھلے ، موٹی تازی ہو جائے۔

○ ...... ماشاء اللہ آپ کا یہ خط بہت معیاری ہے۔ ایسا ہی خط پہلے لکھ دیتے تو اب تک چھپ چکا ہوتا۔ ردّی کی ٹوکری بھی آپ کو جواباً دعا دے رہی ہے کہ خدا کرے آپ خوب لکھیں ، اچھا لکھیں ، اپنا لکھیں۔

فیصل مسعود ، ریاض ، سعودی عرب : انکل ! کیا آنکھ مچولی کے قیمتی تحائف کا سلسلہ صرف پاکستان میں مقیم پاکستانی ساتھیوں کے لئے ہے؟ ہم جیسے بیرون ملک رہنے والے پاکستانی بھی یہ کوپن بھر سکتے ہیں۔

○ ...... بھئی پاکستان سے دور ہو کر آپ لوگ تحفے تحائف کے زیادہ مستحق ہیں اس لئے آنکھ مچولی ایسے موقع پر آپ کو کیسے فراموش کر سکتا ہے مطمئن رہیئے ہمارے ہر تحفے پر آپ کا حق ہے۔

عدنان محمود صدیقی ، حیدر آباد : "دل دل پاکستان" میں آپ وائٹل سائنز گروپ کا انٹرویو شائع کیجئے۔ کیونکہ یہ نغمہ انہوں نے ہی گایا ہے۔

○ ...... ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کی فرمائش کسی نہ کسی شکل میں پوری کی جائے۔

محمد جنید ہارون، سکھر: اگلے سال جنوری ۱۹۹۱ء میں آپ خوفناک نمبر شائع نہیں کریں گے تو سردیوں کی چھٹیوں میں کیا مزہ آئے گا......

○ ...... بہت خوب! آپ چاہتے ہیں کہ لحاف میں چھپ کر خوفناک نمبر پڑھیں تاکہ خوف محسوس ہو تو جلدی سے اندر دبک جائیں۔ ہم سمجھ گئے...... اب اگر کبھی خوفناک نمبر آیا تو موسم گرما میں آئے گا جب کھڑکیاں وغیرہ کھلی ہوتی ہیں۔

عبدالعلیم اشرف، پشاور: آپ نے "سگریٹ چھوڑ دو" کا جو اشتہار رسالے میں دیا تھا میں نے اسے فوٹو اسٹیٹ کر کے جگہ جگہ لگا دیا ہے امید ہے کہ مجھے اس کام کا صلہ ملے گا۔

○ ...... آپ نے نیک کام کیا ہے۔ اور نیک کام کا صلہ کبھی نہ کبھی ضرور ملتا ہے۔ سوچیے اگر آپ کے لگائے ہوئے اشتہار کو پڑھ کر ایک شخص نے بھی سگریٹ نوشی ترک کر دی تو گویا اس نے ایک گھر کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ اس گھر کی دعائیں زندگی میں ہر قدم پر آپ کے ساتھ ہوں گی۔ کیا یہ صلہ نہیں ہے؟

نئے لکھنے والوں سے چند گذارشات

نپولین ھل ایک مشہور مغربی مصنف ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ ادیب نہیں تھا۔ جب اس نے ادیب بننے کا ارادہ کیا تو اسے خیال آیا کہ سب سے پہلے تو اسے زبان آنی چاہئے۔ اس کے پاس الفاظ کا وسیع ذخیرہ ہونا چاہئے اور اسے لکھنے کا فن جاننا چاہئے۔ سو اس مقصد کے لئے نپولین ھل نے ایک لُغت خریدی اور آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ لغت خرید کر اس نے ایک عجیب و غریب حرکت کی۔ اس نے لغت میں سے "ناممکن" کا لفظ قینچی سے کاٹ کر پھینک دیا تھا۔ جب وہ ایسا کر رہا تھا تو وہ ایک گمنام شخص تھا اور لوگ نپولین ھل کے نام کے کسی آدمی سے واقف بھی نہیں تھے لیکن بعد میں وہ ایک کامیاب مصنف کی حیثیت سے دنیا بھر میں جانا پہچانا گیا۔ اس کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئیں اور اس نے اپنی کتابوں سے بے شمار دولت کمائی۔

"آنکھ مچولی" کے دفتر میں ہر ماہ سینکڑوں کہانیاں، مضامین اور نظمیں وغیرہ موصول ہوتی ہیں۔ ان کے زیادہ تر لکھنے والے وہ ساتھی ہوتے ہیں جنھوں نے ابھی نیا نیا لکھنا شروع کیا ہے۔ وہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی تخلیقات رسالے میں بھیجتے ہی فوراً چھپ جائیں گی۔ لیکن جب ایسا نہیں ہوتا تو وہ سخت مایوس ہو جاتے ہیں۔ وہ ہم سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ ہمیں غصے اور دھمکیوں سے بھرے خطوط لکھتے ہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب سے یہ رسالہ نکلا ہے اور شاید آئندہ بھی جاری رہے۔

ساتھی یہ نہیں سوچتے کہ کوئی بھی تحریر جب لکھ لی جاتی ہے تو ضروری نہیں کہ وہ چھپنے کے قابل بھی ہو۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ جب آپ کھیلنے کے لئے کرکٹ کا بلاّ اٹھاتے ہیں تو آپ کو فوراً ہی اسکول یا کالج کی ٹیم میں شامل ہو کر کسی میچ میں حصہ لینے کا موقع تو نہیں مل جاتا۔ آپ پہلے اپنی گلی یا میدان میں کھیل سیکھتے ہیں، جب آپ کا کھیل دوسروں سے بہتر ہو جاتا ہے اس کے بعد ہی آپ اس میں ترقی کر کے کسی ٹیم میں شامل ہو کر میچ کھیل رہے ہوتے ہیں۔ لکھنا بھی ایک فن ہے جو آہستہ آہستہ آتا ہے۔ جب کوئی تحریر شائع نہیں ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی آپ کو اس فن میں اور محنت کرنی چاہئے۔ جب آپ مسلسل لکھتے رہیں گے اور ساتھ ہی ساتھ اچھی تحریروں کا مطالعہ جاری رکھیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کی تحریر رسالے کی زینت نہ بنے۔ تحریر شائع نہ ہونے کی صورت میں یہ سمجھنا کہ رسالے والے تو صرف اپنے رشتہ داروں کی چیزیں چھاپتے ہیں یا ضرور ان کی ذات سے رسالے کے ایڈیٹر کی دشمنی ہے، یہ قطعی درست نہیں ہے۔ اس قسم کی بدگمانی سے آدمی ادیب بننا تو دور کی بات اچھا انسان بھی نہیں بن سکتا۔ اس لئے تمام نئے لکھنے والوں سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ مستقل مزاجی سے لکھنے کے فن پر عبور حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے۔ لیکن اس سے پہلے انہیں اپنی لغت سے نپولین ھل کی طرح "ناممکن" کے لفظ کو کاٹ پھینکنا ہوگا۔ تبھی تو وہ مایوسی سے بچے رہیں گے اور ایک دن نپولین ھل کی طرح مشہور مصنف بن سکیں گے۔

عامر اقبال خانزادہ ، ڈرگ کالونی ، کراچی ۔ انکل! ایک بار پھر حیدر آباد میں خون کی ہولی کھیلی گئی مسلمان، مسلمان کو کیوں مار رہا ہے۔ ہم پنجابی، سندھی، مہاجر اور پٹھان کے بجائے اصل میں تو پاکستانی ہیں۔ یہ بات بڑوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟

○ ...... میرے بھائی! اگر ہمارے بڑوں میں سمجھ بوجھ ہوتی تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟ خدا کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ انہی بُرے حالات میں بہتری کی کوئی نہ کوئی صورت نکلے گی۔ انشاء اللہ

سیما عقیل الرحمان ، حیدر آباد ۔ آپ آنکھ مچولی میں صرف تعریفی خط شائع کرتے ہیں اس لئے میں بھی تعریف کر دیتی ہوں کہ آنکھ مچولی کا سرورق اور کہانیاں اعلیٰ معیار کی ہوتی ہیں۔ میں نے آج تک اتنا عمدہ رسالہ نہیں پڑھا۔ میں اسے ایک دن میں پورا پڑھ ڈالتی ہوں (ویسے یہ تعریف جھوٹی نہیں ہے)

○ ...... آپ آنکھ مچولی میں صرف تعریفی خطوط کیوں پڑھتی ہیں؟ تنقیدی خطوط بھی تو چھپتے ہیں اگر یقین نہ آئے تو پچھلے شمارے دیکھ لیجئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں آپ کی تعریف سے ہماری حوصلہ افزائی ہوتی ہے وہاں آپ کی تنقید سے ہمیں اپنے معیار کو بہتر بنانے میں بھی مدد ملتی ہے۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز

عبید اللہ اظہر

"مروان کے بیٹو! میرا خیال ہے کہ امت مسلمہ کی آدھی یا دو تہائی دولت تمہارے قبضے میں ہے۔"
صبح کا وقت اور دمشق کا قصرِ شاہی۔ چھتیس سینتیس سال کا ایک وجیہہ نوجوان شاہی خاندان کے مردوں سے مخاطب ہے۔ اس کے چہرے سے ایک عجیب قسم کی اداسی ٹپک رہی ہے۔ اس کا جسم موٹا تازہ ہے اور اس عیش و عشرت کا مظہر ہے۔ جس میں وہ پل کر جوان ہوا ہے۔ لیکن اب اس پر خوف خدا اور آخرت کی باز پُرس کا احساس چھا چکا ہے۔

سننے والوں کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔ شاید وہ سمجھ گئے ہیں کہ نوجوان کیا کہنا چاہتا ہے؟ اور پھر وہ یکدم پکار اٹھے ہیں۔ "بخدا جب تک ہماری گردنوں پر سر موجود ہیں یہ نہیں ہو سکتا، ہم نہ تو اپنے باپ دادا کو ظالم اور غاصب بنائیں گے اور نہ ہی اپنی اولاد کو مفلس و قلاش" نوجوان نے صبر و سکون کے ساتھ ان کا احتجاج سنا اور پھر بولا "ناجائز دولت ناجائز ہے۔ رعایا کی املاک پر قبضہ یکسر حرام ہے۔ اس ناجائز اور حرام کو مٹانے میں اگر میری مدد نہیں کرو گے تو تم لوگ جس عزت و شرف کی بنیاد پر اپنا حق جتا رہے ہو اس سے میں تمہیں محروم کر دوں گا اور ذلت و رسوائی تمہارا مقدر بن جائے گی۔"

نوجوان کی آواز بلند ہو گئی۔ "میرے پاس سے چلے جاؤ۔" وہ تقریباً چیختے ہوئے بولا۔ یہ مجلس کے برخاست ہونے کا اعلان بھی ہے اور اس بات کا نوٹس بھی، کہ جن حرام اور ناجائز املاک اور جاگیروں سے تم ازخود دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہو، میں انہیں زبردستی چھین کر ان کے اصل مالکوں کو دے دوں گا۔ بنو اُمیّہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے اور چلے گئے۔ ایک بزرگ تلملاتے ہوئے کہتا ہے۔ "عبدالعزیز نے جب عمرؓ ابن خطاب کی پوتی سے شادی کی تھی تو میں نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ ہمارے خاندان میں عمر فاروقؓ کا خون بھی شامل ہو چلا ہے اور اس کا ایک روز ہمیں خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

نوجوان خلیفہ قصر شاہی سے اٹھ کر مسجد میں آ پہنچا ہے، جہاں عام مسلمان منادی کے ذریعے پہلے سے جمع ہو چکے ہیں۔ حمد و ثنا کے بعد انہیں مخاطب کرتا ہے۔ "لوگو! بنو امیہ نے ہمیں عطیات اور جاگیریں دیں۔ خدا کی قسم نہ تو انہیں دینے کا حق تھا اور نہ ہمیں لینے کا۔ اب میں ان سب کو ان کے اصل حق دار وں کو واپس کرتا ہوں اور اس کا آغاز اپنی ذات سے اور اپنے خاندان سے کرتا ہوں۔"

لوگ حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آتا۔ لیکن آئے یا نہ آئے، اپنے عہد کی سب سے بڑی معاشی اصلاح کا اعلان ہو چکا ہے اور پھر ان کی آنکھیں جو منظر دیکھتی ہیں اس سے سب دم بخود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے غلام کی طرف دیکھتے اور کہتے ہیں۔ "وہ شاہی دستاویزات لاؤ جن کے ذریعہ عطیات اور جاگیر ہمارے نام کی گئیں" دستاویزات لائی گئیں۔ ایک شاہی کارندے نے بلند آواز سے مجمع کو سنائیں اور پھر انہیں عمر بن عبدالعزیز کو دے دیا۔ آپ نے قینچی کے ذریعے ساری دستاویزات پرزے پرزے کر دیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی بیوی فاطمہ عبدالمالک کا بیان ہے کہ ایک رات میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ایک عجیب اضطراب و بے خودی کے عالم میں بیٹھے ہوئے ہیں، سر دونوں ہاتھوں پر جھکا ہوا ہے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ رہا ہے۔ زبان آہ و زاری میں مصروف ہے اور سسکیوں سے آواز بھرائی ہوئی ہے۔ یہ دردناک منظر دیکھ کر میں بے چین ہو گئی، گھبرا کر اٹھی اور بے تابی سے ان کے پاس پہنچی۔ کچھ دیر مجھ پر سکتے کا سا عالم طاری رہا۔ ان کی حالت دیکھ کر دل امنڈا آ رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور ہمت کر کے پوچھا "خیر تو ہے فرمایئے کیا تکلیف ہے، آخر اس گریہ و زاری کا سبب کیا ہے؟۔"

کچھ دیر تو وہ خاموش رہے۔ جب میں بہت پیچھے پڑی تو فرمایا۔ "فاطمہ تمہیں اس سے کیا غرض۔" لیکن جب میں نے پھر اصرار کیا اور کہا "میں چاہتی ہوں کہ آپ کی تکلیف کا سبب معلوم کروں اور اس کو دور کرنے میں آپ کی مدد کروں۔" تو فرمایا "میں اپنے آپ کو ایک عجیب مصیبت میں پاتا ہوں اللہ تعالیٰ نے لاکھوں میل کے علاقے کی حکومت میرے سپرد کی ہے، جس میں کروڑوں بندگان خدا آباد ہیں۔ معلوم

نہیں کتنے مریض ہیں جن کی شفایابی کا سامان نہیں، کتنے تنگ دست و فاقہ کش ہیں، کتنے قیدی ہیں جو دشمنوں کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا ہیں، کتنے یتیم اور بیوائیں ہیں جن کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ قیامت کے دن جب اللہ اپنے تمام بندوں اور رسول اللہ خاص طور پر اپنی امت کی نگہبانی کے بارے میں مجھ سے دریافت کریں گے تو میں انہیں کیا جواب دوں گا۔ بس اسی خیال سے میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔"

آپ کی بیوی کے بقول "کبھی کبھی ان کی حالت اس درجہ اضطراب انگیز ہو جاتی کہ میں گھبرا جاتی تھی۔ دل میں پریشان کن خیالات آتے اور سوچنے لگتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ غم کی شدت میں ان کی روح پرواز کر جائے اور صبح جب لوگ اٹھیں تو انہیں معلوم ہو کہ ان کا خلیفہ ختم ہو چکا ہے۔"

فاطمہ بنت عبدالمالک خود ایک امیر خاندان کی لڑکی تھیں۔ شادی کے دن عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کے گلے میں قیمتی ہار دیکھے تو فرمایا "یہ سب مال مسلمانوں کا ہے۔ اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو یہ زیورات بیت المال کو واپس کر دو، ورنہ تمہارا راستہ الگ ہے اور میرا الگ۔" فاطمہ نے اسی وقت تمام قیمتی زیورات اتار کر بیت المال بھیج دیئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور خلافت میں بھیڑ بکریوں کے ساتھ ساتھ بھیڑیئے بھی گھومتے تھے۔ لیکن کسی بھیڑیئے کی ہمت نہ ہوتی کہ وہ کسی بکری پر حملہ کر دے۔ ایک دن دور دراز علاقے میں ایک گڈریا ریوڑ چرا رہا تھا کہ ایک بھیڑیئے نے بکری پر حملہ کر دیا۔ اس وقت گڈریئے نے لوگوں سے کہا کہ آج حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فوت ہو چکے ہیں۔ لوگوں کو گڈریئے کے باتوں پر یقین نہ آیا لیکن جب تصدیق کی گئی تو لوگ حیران رہ گئے۔ گڈریئے کی بات سچ تھی۔

انہی خصوصیات کے باعث حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو پانچواں خلیفہ کہتے ہیں۔ انہوں نے عدل و انصاف سے حکمرانی کی۔ ایک رات ان کے ہاں مہمان آیا۔ حضرت عمرؒ چراغ کی روشنی میں کچھ لکھ رہے تھے کہ چراغ کا تیل ختم ہو گیا۔ مہمان نے کہا "کسی غلام کو جگا دوں؟" حضرت عمرؒ نے منع کیا کہ نوکر دن بھر کام کر کے تھک گئے ہوں گے ان کو تکلیف دینا ٹھیک نہیں۔ مہمان نے پیش کش کی کہ میں خود چراغ میں تیل ڈال کر آتا ہوں۔ لیکن حضرت عمرؒ نے کہا کہ مہمانوں کو تکلیف دینا مہمان نوازی کے خلاف ہے۔ یہ کہہ کر حضرت عمرؒ خود اٹھ کر چراغ میں تیل ڈال کر آئے اور کہا کہ میں اٹھتے وقت بھی عمر بن عبدالعزیز تھا، بیٹھتے وقت بھی عمر بن عبدالعزیز ہوں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم ا...
ندامت سے جھک جاتے ہیں۔ معلوم نہیں ...
ہوں گے؟۔

یہ کامیابی آپ کی ہے

۱۶ ، جون ۱۹۹۰ء کو فیصل مسجد اسلام آباد کے حسین آڈیٹوریم میں
سینکڑوں بچوں، والدین اور پاکستان بھر کے بچوں کے رسائل کے
مدیران کی موجودگی میں

آنکھ مچولی کو ۱۹۸۹ء کا پاکستان کا سب سے بہترین رسالہ قرار دیا گیا

پُرجوش تالیوں اور نعرہ ہائے تحسین کے شور میں

☆ اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین جناب غُلام ربّانی آگرو صاحب نے "بہترین رسالے" کی شیلڈ آنکھ مچولی کے مدیر اعزازی کو عطا کی۔

☆ دعوۃ اکیڈمی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کی جانب سے اس حسین اور یادگار اعزاز کا اعلان ڈائریکٹر جنرل جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی نے کیا۔

یہ اعزاز آنکھ مچولی کے معیار کی جیت ہے
جس پر ہم ربُ العزت کا شکر ادا کرتے ہیں

یہ کامیابی ..... ہماری نہیں ..... آپ کی ہے ..... اس لئے کہ ....

آنکھ مچولی آپ ہی کی تحریروں سے سج دھج کر شائع ہوتا ہے۔ اِسے آپ ہی کی تجاویز کی روشنی میں ترتیب دیا جاتا ہے

ہم وعدہ کرتے ہیں آنکھ مچولی کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے اپنی کوششوں میں کوئی کمی نہیں آنے دیں گے۔

آپ بھی وعدہ کیجئے آپ اسے حسین تر بنانے کے لئے اپنی تجاویز ضرور بھجوائیں گے۔

تفصیلات :- آئندہ ماہ دِل دِل پاکستان نمبر میں ضرور پڑھیئے۔

جام جیلی مارملیڈ
اب نئے انٹرنیشنل پیک میں
Produce of Pakistan
AHMED
RASPBERRY JAM
Produce of Pakistan
AHMED
APPLE JELLY
Produce of Pakistan
AHMED
ORANGE MARMALADE
قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا

رنگ بھی میرے عجیب ہیں ڈھنگ بھی میرے عجیب

اُلٹا لٹک کے بھی مجھے گرنے کا ڈر نہیں

یہ گدیاں مجھے چلنے میں ہیلپ دیتی ہیں

مُڑا ناخون بھی میری پکڑ مضبوط کرتا ہے

مدد سے میں زبان کی اپنی آنکھیں صاف کرتا ہوں

یہ میرے دانت ہیں
کوئی گھلتی
برف نہیں

کلوزاپ میں لگتی ہے یوں کھال میری

یہ چہرے سے میں خوفناک ہوں، رنگ میں لال اور پیلا ہوں

لیکن سچی بات تو یہ ہے میں بے حد شرمیلا ہوں

سلمٰی السلیم

چیزوں کو گرفت میں رکھنے کے لئے قوت کے ساتھ ساتھ مہارت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانوں کے برعکس بہت سے حیوانات خاص طور پر رینگنے والے حیوانات کو یہ صلاحیت پیدائشی طور پر حاصل ہوتی ہے۔

چیزوں کو گرفت میں رکھنے کی صلاحیت اکثر رینگنے والے حیوانات کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اگر یہ صلاحیت ان کے پاس نہ ہو تو وہ دو دن بھی زندہ نہ رہ سکیں۔ برابر کے صفحہ پر موجودہ جیکو نسل کا گرگٹ ایسے ہی حیوانات

میں سے ایک ہے جو اپنے گدوں والے پنجوں کی مدد سے درخت کی پتلی سے پتلی اور کمزور سے کمزور شاخ پر بہ آسانی چڑھ چل اور لٹک سکتا ہے۔ درختوں پر ہی نہیں چکنی دیواروں اور چھتوں پر بھی جیکو صاحب بڑی پھرتی کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ ماہرین کے بقول یہ سب ان کے پنجوں کے ملائم گدوں کا کمال ہے۔

جیکو صاحب چہرے سے بڑے خوفناک نظر آتے ہیں۔ لیکن آپ ان کی شکل پر نہ جائیں۔ یہ بالکل آپ پر (چلیں ہم پر) گئے ہیں۔ یعنی لگتے تو خوفناک ہیں مگر فطرتاً بہت ہی شرمیلے ہیں اور لوگوں کے درمیان جاتے ہوئے بہت ہچکچاتے ہیں۔ ان تصاویر میں ان کا جسم بھی بہت بڑا نظر آرہا ہے۔ دراصل یہ سب کیمرے کا کمال ہے ورنہ ایک جیکو گرگٹ بارہ انچ سے زیادہ لمبا نہیں ہوتا۔

عام گرگٹوں کے برعکس جیکو کو اللہ میاں نے ایک حیرت انگیز صلاحیت دی ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی دشمن ان کی دم پکڑ لیتا ہے تو یہ دم کا پچھلا حصہ اس کے منہ میں چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ ان کی کٹی ہوئی دم اللہ کی قدرت سے بہت جلد پہلے جیسی ہو جاتی ہے۔

گذشتہ ایک برس میں گرگٹوں پر آنکھ مچولی میں یہ دوسرا یا تیسرا آئٹم ہے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ گرگٹوں سے ہماری دوستی یا رشتہ داری ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ جب کسی چیز کی کثرت ہو جاتی ہے تو وہ ہر جگہ اور بار بار موضوع بحث بننے لگتی ہے۔ جیسے فسادات اپنی کثرت کے باعث ہر اخبار اور رسالے میں بار بار موضوع بحث بن رہے ہیں۔ ہمیں چونکہ ہر طرف گرگٹ ہی گرگٹ نظر آنے لگے ہیں۔

اس لئے ہم آنکھ مچولی کے صفحات میں بار بار ان کا تذکرہ کرنے لگے ہیں۔ کیا آپ کو یقین نہیں کہ ہمارے یہاں گرگٹوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے؟ بھئی ہمیں تو آئینے میں بھی گرگٹ ہی نظر آتا ہے۔ آپ بھی ذرا اپنے اطراف میں اور پھر آئینہ دیکھ کر بتائیں کہ ہماری بات سچ ہے یا جھوٹ؟ اگر ہماری بات سچ ثابت ہو تو ہماری ذہانت کی داد دیجئے گا اور اگر جھوٹ ثابت ہو تو اسے مذاق سمجھے گا!

کیریئر بلڈنگ کے موضوع پر اردو اور پاکستان کی پہلی کتاب

زندگی کے راستے

عبدالسلام سلامی

انٹر کے بعد کیریئر کے انتخاب کا فیصلہ کیسے کیا جائے؟
۲۴۰ اہم پیشوں میں تعلیم و تربیت اور ملازمت کے مواقع کیا ہیں؟
تفصیلی معلومات فراہم کرنے والے ۲۷ مضامین
نوجوان طلبہ و طالبات کے لیے ایک راہ نما کتاب
جو والدین اور اساتذہ کے لیے بھی مفید ہے
قیمت پاکستان میں ۶۵ روپے، مشرق وسطیٰ ۱۰۰ روپے
براہ راست بنک ڈرافٹ بھیجنے کا پتا
قلم دوست
QALAM DOST
POST BOX NO. 11002, KARACHI-75230, PAKISTAN
پوسٹ بکس نمبر 11002 کراچی 75230 (پاکستان)

عید الاضحیٰ

امان اللہ نیر شوکت

عیدِ قرباں کیا مزے کی عید ہے — اِک مبارک خواب کی تمہید ہے
خواب میں دیکھا تھا ابراہیمؑ نے — ذبح اپنے لال کو کرتے ہوئے
کب ہمارا یا تمہارا خواب تھا — وہ نبیؑ تھے ان کا سچّا خواب تھا
خواب کیا تھا کبریّا کا حکم تھا — سخت مشکل یہ خُدا کا حکم تھا
لے کر اپنے گھر سے بیٹے کو چلے — اور آئے اِک پہاڑی کے تلے
وہ پہاڑی نام ہے جس کا مِنیٰ — جس کے ہے نزدیک اب کعبہ بنا
تھا درختوں کا وہاں سایہ نہ چھاؤں — باپ نے بیٹے کے باندھے ہاتھ پاؤں
ڈال کر کے اپنے چہرے پر نقاب — کر دکھایا آپؑ نے سچا وہ خواب
جب چھُری بیٹے کی گردن پر چلی — باپ کے دل میں مچی، تھی کھلبلی
آنکھ جب کھولی پریشانی ہوئی — دیکھ کر قدرت یہ حیرانی ہوئی
کچھ نہ سمجھے کیا ہوا دیکھا جو حال — بیٹا تھا محفوظ دُنبہ خوں میں لال
دل میں سوچا ہوگئی کیا مجھ سے بھُول — کیوں نہ قربانی ہوئی میری قبول
ناگہاں آ کر فرشتے نے کہا — تیری قربانی سے راضی ہے خُدا
تیرے بیٹے کی نہیں لینی تھی جان — تھا فقط مقصود تیرا امتحان

غیب سے آیا تھا جو دنبہ وہاں
یاد میں اس کی ہیں سب قربانیاں

سیاستدانوں کو خط لکھیئے

ہمارے ملک کے حالات جیسے بھی ہیں آپ کے سامنے ہیں

یہ ملک آپ کا ہے۔ مستقبل میں اس کی باگ ڈور آپ کو سنبھالنی ہے

ملک خوشحال ہوگا تو آپ خوشحال ہوں گے اور خدانخواستہ اس کے مسائل

بڑھتے ہیں تو گویا آپ کی پریشانیوں میں اضافہ ہوگا۔

چونکہ ملک کا نظام چلانے اور اُسے ٹھیک رکھنے کی ذمہ داری
بہرحال سیاستدانوں کی ہوتی ہے۔ اگر سیاستدان اپنی
ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے تو یہ آپ کا بھی فرض ہے
کہ آپ انہیں ان کی ذمہ داریاں بصد عزت و احترام یاد دلائیں

ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ

آپ ملکی سیاستدانوں میں سے جس سیاستدان سے جو کچھ بھی اپیل کرنا چاہتے
ہوں ایک خط کی صورت میں ہمیں لکھ بھیجئے ہم اسے شائع کریں گے ۔۔۔

(۱) خط مختصر اور جامع ہونا چاہیئے۔ (۲) اس میں قومی مسائل کی نشاندہی ہونی چاہیئے
(۳) اسے فرقہ وارانہ نسلی، لسانی اور علاقائی تعصبات پر مشتمل نہیں ہونا چاہیئے۔

سیاستدانوں کو خط لکھیئے اور ملکی حالات کو بہتر بنانے میں اپنا حصہ ادا کیجیئے

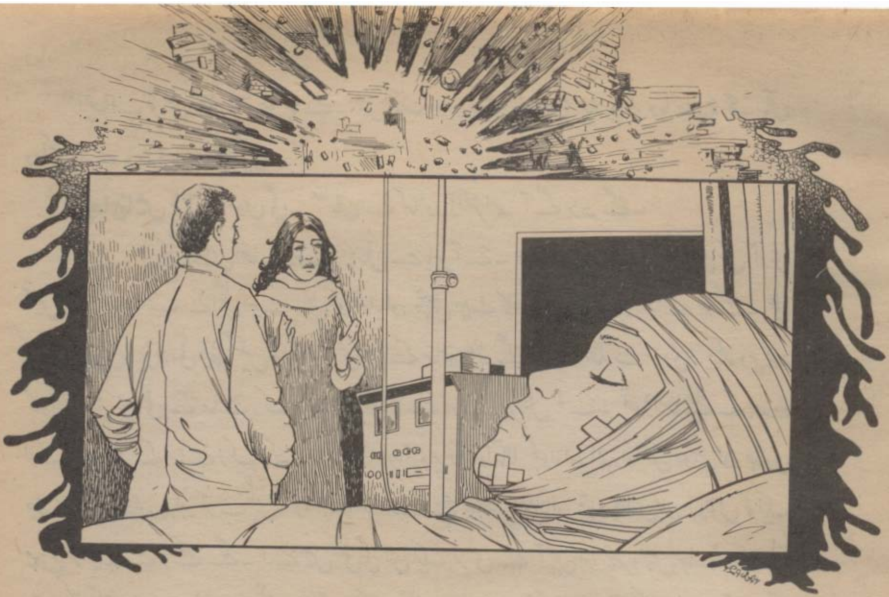

ایک اور دھماکہ

سطوت شادمان

"بھئی اب کیسا ہے ہمارا بیٹا۔" ڈاکٹر احمد نے بیڈ پر لیٹے ہوئے بچے کے گال پیار سے چھوتے ہوئے پوچھا تو بچہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"اچھا یہ دیکھئے ہم آپ کے لئے کیا لائے ہیں، یہ کہہ کر انھوں نے بہت سی ٹافیاں اور پھل اس کے سرہانے رکھ دیئے تو پاس بیٹھی ہوئی اس کی ماں بولی، "ارے ڈاکٹر صاحب آپ اتنی تکلیف کیوں کرتے ہیں۔ ایک تو علاج بالکل مفت کر رہے ہیں اور پھر یہ سب......"

"ارے ماں جی آپ ایسے کیوں سوچتی ہیں۔ یہ تو میرا فرض ہے۔ بس آپ زیادہ سوچا نہ کریں صرف میرے لئے دعا کریں۔" ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹا میں تو ہر وقت دعائیں دیتی رہتی ہوں۔ آپ ہی نے تو اتنے مشکل وقت میں اتنا ساتھ

دیا۔"

"اچھا اب تو علی کافی بہتر ہو گیا ہے۔ بس ایک دو دن میں اسے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ ہاں دوائیں اسے پابندی سے کھلائیں۔"

"اچھا بیٹا میں خیال رکھوں گی۔" ماں نے کہا اور ڈاکٹر احمد آگے بڑھ گئے۔

ڈاکٹر احمد، علی کو گود میں اٹھائے ہوئے اسپتال سے باہر آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے علی کی امی بھی آ رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اگلی سیٹ پر علی کو بٹھایا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔ علی کی ماں دعائیں دیتی ہوئی بیٹھ گئیں تو وہ خود بھی علی کے ساتھ بیٹھ گئے اور کار اسٹارٹ کر دی۔ کچھ دیر بعد کار ایک پتلی سی گلی کے سامنے رک گئی۔ وہ علی کو لئے ہوئے باہر نکل آئے۔ تھوڑا سا چلنے کے بعد وہ لوگ ایک گھر کے سامنے رک گئے۔ ماں نے دروازہ پر لگا ہوا تالا کھولا اور اندر داخل ہوئیں اور جلدی جلدی بستر کی چادر برابر کرنے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بچے کو بستر پر لٹایا اور خود پھلوں اور دواؤں کو ایک میز پر ترتیب سے رکھنے لگے۔ اتنے میں علی کی امی ایک کرسی لے آئیں اور پھر واپس جانے کے لئے مڑیں تو ڈاکٹر صاحب نے پوچھا، "ارے آپ کہاں چلیں" انہوں نے کہا، "ڈاکٹر صاحب آپ کے لئے کچھ چائے وائے...... " "نہیں نہیں آپ یہاں آئیں اور بچے کے پاس بیٹھیں۔ تکلف کی بالکل ضرورت نہیں۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے۔ ہاں کل میں اسے دیکھنے پھر آؤں گا۔" "نہیں ڈاکٹر صاحب یہ کیسا ہو سکتا ہے۔ آپ نے ہمارے لئے اتنی تکلیف کی کم از کم ایک کپ چائے تو آپ کو پینی پڑے گی۔" ماں نے جلدی سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے۔ اور کہا کہ اچھا جیسی آپ کی مرضی۔ چائے پی کر انہوں نے کچھ ہدایات دیں اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے واپس چلے گئے۔

ڈاکٹر احمد اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے فون اٹھایا تو آواز آئی۔ "ڈاکٹر احمد فوراً آئیے ایمرجنسی ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟" انہوں نے چونک کر پوچھا۔

"کلفٹن کے قریب دھماکہ ہو گیا ہے اور بہت سے بچے زخمی ہو گئے ہیں۔ تمام ڈاکٹروں اور نرسوں کو فوراً بلایا گیا ہے۔ آپ بھی فوراً پہنچ جائیے۔" یہ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔ انہوں نے جلدی سے اپنی گاڑی نکالی اور تیزی سے اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہاں پہنچے تو ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوئے تمام بستر زخمی بچوں سے بھرے ہوئے تھے۔ فوری طور پر ان کی مرہم پٹی کا کام شروع ہو گیا۔ کچھ بچوں کو تو تھوڑی دیر میں فارغ کر دیا گیا۔ اور کچھ بچے جو زیادہ زخمی تھے انہیں داخل کر لیا گیا۔

ابھی ڈاکٹر احمد بچوں کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر ایک بیڈ کے پاس کھڑی عورت پر پڑی جسے دیکھ کر وہ چونک گئے۔ وہ علی کی امی تھیں اور بیڈ پر علی بے ہوش پڑا تھا۔ اور اس کے خون چڑھایا جا رہا تھا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھے۔ علی کی امی انہیں دیکھ کر روتے ہوئے کہنے لگیں،

"ڈاکٹر صاحب میرے علی کو بچا لیجئے۔" وہ جلدی جلدی علی کا معائنہ کرنے لگے۔ اس کی حالت کافی خراب تھی۔ کافی خون بہہ گیا تھا اور جسم کہیں کہیں سے جھلس گیا تھا، وہ مکمل طور پر بے ہوش تھا۔

"ڈاکٹر صاحب میرا علی بچ تو جائے گا نا۔" اس کی ماں نے روتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں بس آپ دعا کریں۔ لیکن یہ سب ہوا کیسے؟ یہ ابھی پرسوں ہی تو ڈسچارج ہوا تھا۔" انہوں نے کہا۔

"میں کیا بتاؤں بیٹا، اس کے صحت مند ہونے کی خوشی میں اس کے ماموں اسے گھمانے لے گئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کافی دنوں تک یہ بیمار رہا ہے۔ ذرا دل بہل جائے گا۔ بس وہاں نہ جانے کن ظالموں نے بم رکھا ہوا تھا۔ ارے کوئی ان سے پوچھے کہ ان معصوموں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"اچھا اچھا اب آپ ذہن پر زیادہ زور نہ دیں۔ علی انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"خدا آپ کا بھلا کرے ڈاکٹر صاحب۔ ایک آپ ہیں جو اتنی بے غرضی سے سب کے کام آتے ہیں اور ایک وہ لوگ ہیں جنہیں معصوم بچوں کی جان لیتے ہوئے ذرا دکھ محسوس نہ ہوا۔"

"اچھا ماں جی آپ چپ ہو جائیں۔ علی کا خیل رکھیں۔ بس یہ چند گھنٹوں میں ہوش میں آجائے گا۔ میں ذرا اور بچوں کو بھی دیکھ لوں۔"

ڈاکٹر صاحب علی کی نبض پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔ وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تو وہ کسمساتا رہا اور آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

"علی بیٹا آنکھیں کھولئے، دیکھئے آپ بالکل ٹھیک ہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے پیار سے کہا۔

تھوڑی دیر میں اس نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پاس ہی اس کی امی کھڑی تھیں۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھیں اور اسے پیار کرنے لگیں۔ "علی بیٹا...... علی کیسے ہو تم؟ درد تو نہیں ہو رہا۔"

"ہو رہا ہے۔" اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ارے ارے علی بیٹا روتے نہیں۔ آپ تو بہت بہادر ہیں۔ ابھی ہم آپ کو دوا دیں گے۔ پھر بالکل درد نہیں ہو گا۔" ڈاکٹر صاحب نے اسے روتا دیکھ کر جلدی سے کہا۔ "دیکھئے آپ بہت جلدی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ پھر ہم آپ کو بازار لے جا کر کھلونے دلائیں گے۔ اچھی اچھی چیزیں دلائیں گے۔ آپ کو گھمانے لے جائیں گے۔ اچھے اچھے ...."

"نہیں نہیں میں گھومنے نہیں جاؤں گا۔ میں کبھی گھومنے نہیں جاؤں گا۔" علی خوفزدہ آواز میں چلایا اور پھر زور زور سے رونے لگا۔

"ارے ارے بیٹے......" ڈاکٹر صاحب اتنا ہی کہہ پائے اور علی کو چپ کراتے کراتے خود بھی رو پڑے۔

فرق بتائیں

مرسلہ: کاشف طاہر الریاض سعودیہ

طاہر مسعود

ہمیں کیوں ضائع کیا جا رہا ہے

دو ننھے دانشور نوشین اور رافع سے بات چیت

مجھے بچے اچھے لگتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ہوتے ہی اچھے ہیں۔ بس صرف ایسے بچوں سے مل کر افسوس ہوتا ہے جن میں اچھی عادتیں نہ ہوں۔ اس قسم کے بچے بیکار میں اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں اور نہ جانے کس طرح کے دوستوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں کہ ان میں بُرے بھلے کی تمیز بھی ختم ہوجاتی ہے۔ نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ۔ بات کریں گے تو جیسے لٹھ مار دیں گے۔ زبان الگ خراب ہوگی۔ "اڑے" "تڑے" "ابے" اور "یار" منہ پر چڑھا ہوگا۔ کوئی سمجھانے بجھانے کی کوشش کرے گا تو کندھے اُچکا کر ایک طرف کو چل دیں گے ...... گلی کوچوں میں ایسے بچے بکثرت مل جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک بچے کو جب میں نے ایک دن روک کر کہا: "بیٹے! آخر تم اچھے بچوں کی طرح کیوں نہیں رہتے؟"

اس نے پلٹ کر عجیب ٹیڑھے انداز میں کہا: "یہ اچھا بچہ کیا ہوتا ہے؟"
ایک لمحے کے لئے تو میں چکرا کر رہ گیا۔

"ہاں واقعی .... یہ اچھا بچہ کیا ہوتا ہے؟ کیسا ہوتا ہے ؟ اور کہاں ہوتا ہے؟" میں نے سوچا۔

اگلے روز میری ملاقات "اچھے بچوں" سے ہو گئی۔ یہ بہت ہی اچھے بچے تھے۔ ذہین، مہذب، شائستہ، بات چیت کے ادب آداب سے واقف اور دوسری بہت ڈھیر ساری خوبیاں ان میں تھیں .... ان کے نام تھے: نوشین ناز اور رافع نثار زبیری .... ذرا ٹھہریئے .... آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ ان بچوں سے میری ملاقات کیسے ہوئی۔ کیا راہ چلتے، اچانک، اتفاق سے، کسی گھر میں یا کہاں؟ نہیں، اس طریقے سے نہیں۔ اصل میں مجھ تک پہلے ان کی شہرت پہنچی۔ کسی نے مجھے بتایا کہ ثانوی تعلیمی بورڈ کے مقابلۂ، معلوماتِ عامہ میں دو بچوں نے میدان مار لیا۔ ان کی ذہانت اور یاد داشت حیرت انگیز ہے۔ اپنے ملک کے بارے میں ان کی معلومات اتنی وسیع ہے کہ کوئی بھی سوال کر لیجئے، بالکل درست جواب دیں گے۔ انہوں نے مقابلے میں منصفین کو، بورڈ کے چیئرمین کو اور سارے حاضرین کو اپنے جوابات سے حیران کر دیا۔ یہ مقابلہ کراچی کے تمام اسکولوں کے درمیان ہوا تھا۔ قرار داد پاکستان کی گولڈن جوبلی کی تقریبات کے سلسلےمیں پہلے مرحلے میں تحریری مقابلہ ہوا۔ جس میں نوشین اور رافع کامیاب نکلے۔

پھر زبانی مقابلہ ہوا۔ طالبات میں نوشین اور طلبامیں رافع اوّل آئے۔ اس طرح کراچی کے پانچ سو سے زائد اسکولوں کے لاکھوں طلبا و طالبات میں یہ دونوں سب سے زیادہ معلومات رکھنے والے قرار پائے۔ نوشین، گلشن اقبال کے آکسفورڈ ہائی اسکول میں دسویں جماعت کی طالبہ ہے اور رافع نے حبیب پبلک اسکول سے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔

جب میں ان بچوں سے ملنے آکسفورڈ اسکول پہنچا تو نوشین اپنی امی کے ساتھ پرنسپل کے کمرے میں بیٹھی تھی اور رافع چھت کو گھور رہا تھا۔ مقابلے میں نوشین نے رافع سے زیادہ نمبر حاصل کئے تھے اس لئے میں نے بات چیت کا آغاز نوشین ہی سے کیا۔

"ہاں تو بھئی نوشین! میں اپنے سوالات شروع کروں۔ میرے سوالات آسان آسان سے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ جواب میں نوشین مسکرائی۔

"سب سے پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ اچھے بچے کیسے ہوتے ہیں؟"

"اچھے بچے؟" نوشین نے سوچا: "ایسے بچے جو والدین اور استادوں کا ادب کرتے ہوں۔ لکھنے پڑھنے میں دل لگاتے ہوں۔ لڑتے جھگڑتے نہ ہوں۔ خواہ مخواہ کی ضد نہ کرتے ہوں .... ہر کام وقت پر کرتے ہوں .... اور بس"

نوشین کالج کی پرنسپل سے انعام لیتے ہوئے

رافع، مشیر حکومت سندھ سے انعام وصول کر رہے ہیں

"تو کیا تم کہہ سکتی ہو کہ تم ایک اچھی بچی ہو؟" میں نے پوچھا

"میں اپنے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"اس میں ایسی کیا مشکل ہے۔ یہ بتاؤ کے امتحانوں میں تمہارے نمبر کیسے آئے ہیں؟"

"میں کے جی سے اب تک ہمیشہ اپنی کلاس میں فرسٹ آئی ہوں یا پھر سیکنڈ...... میں کبھی تھرڈ نہیں آئی۔"

"ماشاءاللہ۔ پھر تو تم بہت پڑھتی ہوگی۔ مقابلہ معلومات عامہ میں حصہ لینے کی تیاری تم نے کیسے کی۔ میرا مطلب ہے کیا تمہیں اس کے لئے وقت مل گیا؟"

"انکل! ایک دن میں چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں اور یہ بہت ہیں۔ میں اپنا وقت بالکل بھی ضائع نہیں کرتی۔ اسکول کی پڑھائی بھی کرتی ہوں۔ گھر کے کاموں میں ہاتھ بھی بٹاتی ہوں۔ ٹیلی ویژن کے ڈرامے بھی دیکھتی ہوں اور پھر معلومات عامہ کی کتابیں بھی پڑھتی ہوں .... میں نے کبھی ٹیوشن نہیں پڑھی۔ اس کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔"

"ٹیلی ویژن کے ڈرامے اور دوسرے پروگرام کیسے لگتے ہیں؟"

"ٹیلی ویژن کے ڈرامے اب اچھے نہیں ہوتے .... اور بچوں کے جو پروگرام ہیں وہ بالکل ہی چھوٹے بچوں کے ہوتے ہیں .... نویں اور دسویں جماعت کے بچوں کے تو ٹیلی ویژن پر پروگرام ہی نہیں آتے۔ اس لئے ہم لوگ بڑوں کے پروگرام دیکھتے ہیں۔"

"نوشین! تم نے ایسے بہت سے بچے دیکھے ہوں گے جو سارا وقت ٹیلی ویژن سیٹ کے آگے بیٹھے رہتے ہیں یا پھر وی سی آر دیکھتے رہتے ہیں یا ویڈیو گیمز میں مصروف رہتے ہیں۔ کیا یہ کوئی اچھی بات ہے؟"

اس میں کوتاہی والدین کی ہے۔ "نوشین نے نہایت اعتماد سے کہا جیسے اس نے اس مسئلے پر پہلے

سے سوچ رکھا ہو۔" والدین کو بچوں کے ساتھ حد سے زیادہ نرمی کا سلوک نہیں کرنا چاہئے کہ وہ ان کا کہا بھی نہ مانیں۔ شروع میں جب بچوں کو ڈھیل دے دی جاتی ہے تو پھر بعد میں ان کو ٹھیک کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔"

نوشین کی امی نے سر ہلایا جیسے انہیں اپنی بیٹی کی بات سے مکمل اتفاق ہو۔

"حالات اچھے نہیں ہیں۔" میں نے موضوع بدلا: "تم دیکھتی ہو گی کہ ہر طرف قومیتوں کے نعرے لگ رہے ہیں۔ گولیاں چل رہی ہیں۔ لوگ ہلاک ہو رہے ہیں۔ تم ان سب چیزوں کو کس طرح دیکھتی ہو؟"

"اس لئے کہ ہم میں خود غرضی آ گئی ہے۔ ملک کی فکر کسی کو نہیں ہے۔" نوشین نے جواب دیا: "سب کو اپنے مفادات پیارے ہو گئے ہیں۔ اور ہم یہ بھول گئے ہیں کہ سب سے پہلے پاکستانی ہیں پھر کچھ اور ہیں۔ آج ہم مہاجر، سندھی، پنجابی، اور پٹھان کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ قومیتوں کے جھنڈے اٹھا کر چلتے ہیں لیکن پاکستانی ہونے کی حیثیت کو بھول گئے ہیں۔"

"یہ تو بڑی تشویش ناک بات ہے۔ پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہو گا؟" میں نے کریدا۔

"اس طرح سے کہ تعلیمی اداروں میں اچھی تعلیم دی جائے .... وطن سے محبت پیدا کی جائے۔ بچوں میں اتنا شعور پیدا کیا جائے کہ وہ بُرے بھلے کی تمیز کر سکیں۔"

"اور اس میں حکومت کا کیا فرض ہے؟"

"حکومت کو چاہئے کہ وہ پچھلی حکومت کو بُرا بھلا کہنے کے بجائے اپنی کارکردگی کو بہتر بنائے۔ ملک کے نظام کو بہتر بنائے کیوں کہ بچے اپنے ماحول ہی سے سب کچھ سیکھتے ہیں۔ ان کے چاروں طرف جیسے نعرے گونجیں گے ظاہر ہے وہ وہی تو سیکھیں گے۔"

"بھئی آج کل تو میں دیکھتا ہوں بچے بھی سیاست میں پر جوش طریقے سے حصہ لینے لگے ہیں۔ وہ نعرے لگاتے ہیں دیواروں پر پوسٹر لگاتے ہیں، سینے پر بیجز لگاتے ہیں۔ کیا بچوں کو اس طرح سے سیاست میں حصہ لینا چاہئے؟ کیوں بھئی رافع تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے رافع کو مخاطب کیا جو اب تک ہماری گفتگو خاموشی سے سن رہا تھا۔

"یہ رجحان اچھا نہیں ہے" رافع نے کہا: "سیاست کا کام سیاستدانوں پر چھوڑ دینا چاہئے۔ لیکن بات یہ ہے کہ انکل! بچوں کے پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہیں ہے۔ اور سیاست میں تو وہی پڑتا ہے جس کے پاس فرصت ہو۔ سیاستدانوں کو تو نعرے لگانے والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کچھ اور نہیں تو انہی بچوں کو، لڑکوں کو استعمال کرتے ہیں۔ سارے فسادات کی جڑ یہی سیاستداں ہیں۔ ان کی وجہ سے مفاد

رافع اور نوشین انعام لینے کے بعد مشیر حکومت سندھ اقبال یوسف اور چیئرمین ثانوی تعلیمی بورڈ کے ہمراہ

پرستی بڑھی ہے اور قومی احساس بالکل ختم ہو گیا ہے۔"

"کیوں بھئی نوشین! کیا رافع کے خیالات ٹھیک ہیں۔ کیا تمہیں اتفاق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" نوشین نے تائید کی۔

"ہاں مگر دیکھو نا بچے یہ نہ کریں تو اور کیا کریں۔ ان کے لئے کھیلنے کے لئے میدان اور پارکیں تک تو ہیں نہیں۔" میں نے کہا۔

"جی ہیں! اور جو پارکیں ہیں ان کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ گھاس سوکھ گئی ہے، پودے خشک ہو گئے ہیں اور ہر وقت دھول اڑتی رہتی ہے۔" رافع نے لقمہ دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ رافع .... تمہاری عمر کے بے شمار بچے گیراجوں میں میکینک کا کام کرتے ہیں۔ آئس کریم کی دکانوں پر بیرا گیری کرتے ہیں، پھول اور تولئے بیچتے ہیں۔ جوتے پالش کرتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر تمہیں کیا خیال آتا ہے .... کیا تم نہیں سوچتے ہیں کہ انہیں بھی پڑھنا لکھنا چاہئے" میرا سوال ذرا طویل تھا لیکن رافع نے غور سے سنا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا نوشین بول پڑی۔

"ان بچوں کی عمر یقیناً تعلیم حاصل کرنے کی ہوتی ہے۔ لیکن تعلیم دلانا آسان کام تو نہیں ہے۔ ان کے والدین سوچتے ہیں کہ پڑھانے لکھانے میں وقت ضائع کرانے سے بہتر ہے کہ انہیں ملازمتیں دلا دی جائیں۔ کوئی ہنر سیکھ لیں گے تو یہی آگے چل کر ان کے کام آئے گا۔"

"بالکل" رافع نے بات آگے بڑھائی "پہلے غریب لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلا کر خوش ہوتے تھے۔ لیکن آج جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایم اے، ایم ایس سی کر کے لوگ مارے مارے پھر رہے ہیں تو غریب لوگوں نے تعلیم دلانا چھوڑ دیا ہے .... مطلب یہ ہے کہ تعلیم اتنی مفید نہیں رہی۔"

"تو پھر کیا تعلیم کو خیرباد کہہ دینا چاہئے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں......... میں نے کب کہا ہے" رافع بولا۔ "ہمیں اپنے آپ کو پوری دنیا سے منوانا ہے۔ اور تعلیم کے بغیر ایسا کیسے ممکن ہے؟ ہمیں تعلیم کو عام کرنا ہی ہوگا کیوں کہ تعلیم سے سوچنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ امیر اور غریب کا لحاظ کئے بغیر......... ایک بامقصد تعلیم دینی ہی ہوگی۔" رافع کا لہجہ بڑا دانشورانہ تھا۔ (سچی بات یہ ہے کہ میں ان بچوں کے خیالات سن کر حیرت زدہ تھا، مرعوب تھا۔ یہ کتنے سمجھدار تھے، ان کے خیالات کس قدر پختہ تھے۔ ان کی نظر کتنی وسیع تھی۔)

اور ہاں ایک بات یہ کہ "نوشین بیچ میں بول پڑی" اردو اور انگریزی میڈیم اسکولوں کا فرق ختم کیا جانا چاہئے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں کے بچے انگریزی میں کمزور ہونے کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ انگریزی میں کمزور کیوں نہ ہوں۔

انگریزی کا مضمون اچانک انہیں چھٹی جماعت میں آکر پڑھنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے انہیں بہت دشواری ہوتی ہے۔ انگریزی کا مضمون انہیں پہلی جماعت سے پڑھانا چاہئے۔"

"دنیا کتنی ایڈوانس ہو گئی ہے۔" رافع نے کہا۔ "اور ہمارے ہاں وہی فرسودہ نظام چل رہا ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھئے۔ میٹرک میں انگریزی کی ٹیکسٹ بک ۱۹۷۶ء میں آئی تھی اور آج تک وہی ٹیکسٹ بک چل رہی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔"

"ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم لوگوں کو اپنے اساتذہ سے بھی کوئی شکایت ہے؟"

"ہاتھ کی انگلیوں کی طرح سارے اساتذہ بھی ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں۔" رافع نے فوراً ہی جواب دیا۔ "کچھ اساتذہ طلبا کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے ہیں .... ان پر محنت کرتے ہیں۔ اور کچھ اساتذہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سہل پسند ہوتے ہیں۔ کلاس میں جی چاہا تو آگئے نہیں چاہا تو نہیں آئے۔"

"وہ اسے ملازمت کی طرح لیتے ہیں" نوشین نے کہا۔ "جیسے سرکاری ملازمین ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ تو مقدس پیشہ ہے۔ اسے عام نوکری کی طرح نہیں سمجھنا چاہئے۔"

"ایسے اساتذہ کی اصلاح کیسے کی جاسکتی ہے؟" میں نے کہا۔ اور پھر کہنے کے بعد سوچنے لگا کہ پتہ

نہیں مجھے یہ بات پوچھنی چاہئے بھی تھی یا نہیں۔ لیکن اب تو پوچھ ہی چکا تھا۔

رافع نے کہا: "ایسے اساتذہ کو اپنے فرض کا خود احساس کرنا چاہئے۔"

نوشین بولی: "کیوں کہ آدمی خود ہی اپنے آپ کو ٹھیک کر سکتا ہے۔ کوئی دوسرا تو نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا: "لیکن اگر وہ خود سے اپنی اصلاح کر سکتے پھر وہ ایسے ہوتے ہی کیوں؟"

رافع نے کہا: "پھر اس مسئلے پر محکمہ تعلیم کو غور کرنا چاہئے۔ ہم کیا بتا سکتے ہیں۔"

"ہاں یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "رافع! ہمارے تعلیمی نظام میں تمہیں اور بھی کچھ خرابیاں نظر آتی ہیں؟"

"ہمارے تعلیمی نظام میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ طلبا کا وقت بہت ضائع کیا جاتا ہے۔" رافع نے کہا: "میری مثال لیجئے۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد میں چھ سات ماہ سے بیکار بیٹھا ہوں۔ میرے پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہیں ہے۔ دنیا اب اتنی ترقی کر چکی ہے کہ رزلٹ مرتب کرنے میں ایک مہینے سے زیادہ وقت نہیں لگنا چاہئے۔ اب تو کمپیوٹر بھی آ چکا ہے۔ لیکن دیکھئے نا اساتذہ بھی اب ہڑتال کرنے لگے ہیں۔ "جب طلباء کا وقت ضائع کیا جاتا ہے وہ گھر میں بیکار بیٹھے ہوتے ہیں تو ان کے ذہن میں تخریبی خیالات آتے ہیں اس لئے یہ مسئلہ بڑا سنگین ہے۔" نوشین بولی۔

"بھئی تم لوگوں نے اساتذہ اور نظام تعلیم نظام کی خرابیاں تو گنوا دیں............ یہ بھی تو بتاؤ کہ طلباء میں کیا کیا خرابیاں ہیں۔ ہم نے تو ایسے لڑکے بھی دیکھے ہیں جو اساتذہ کی عزت نہیں کرتے، انہیں پلٹ کر جواب دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ یہ بات ٹھیک ہے۔ اساتذہ جیسے بھی ہوں بہر حال وہ اساتذہ ہیں۔ ان کی عزت کرنی چاہئے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ جو لڑکا استاد کی عزت نہیں کرتا وہ گھر پر اپنے والدین کی بھی عزت نہیں کرتا۔ یہ سب ماحول اور تربیت کا قصور ہے۔ وڈیو فلمیں دیکھ دیکھ کر ان میں خود سری آ گئی ہے۔" رافع نے جواب دیا۔

"انکل! اچھے بُرے بچے تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔" نوشین بولی: "تمام بچے تو اچھے نہیں ہو سکتے۔ ایسے بچوں کو ٹھیک کرنے کے لئے والدین کو انہیں زیادہ وقت دینا ہو گا۔ ان پر زیادہ توجہ کرنی ہو گی۔ والدین اور اساتذہ کو بھی۔ انہیں صرف بُرا کہنے سے وہ کبھی اچھے نہیں ہوں گے۔"

گویا یہ ذمہ داری والدین ہی کی ہے!" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ والدین بچوں کو وقت نہیں دیتے۔" نوشین نے کہا: "ان کی مصروفیات بڑھ گئی

ہیں۔"

"کچھ عجیب سامعاملہ ہے" رافع نے کہا: "والدین بچوں کو بالکل آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ یا انہیں وقت دیتے ہیں تو اتنا زیادہ وقت دیتے ہیں کہ لگتا ہے سر پر سوار ہیں۔ ہر وقت کی روک ٹوک سے بھی بچے خراب ہو جاتے ہیں۔ بچوں پر نظر ضرور رکھنی چاہئے۔ اگر وہ کوئی غلط کام کریں تو انہیں سمجھائیں بجھائیں۔ یہی صحیح طریقہ ہے۔"

نوشین اور رافع .... " میں نے کہا: "تم دونوں کی گفتگو نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میں نے تم دونوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ جب میں یہاں تم لوگوں کا انٹرویو کرنے آ رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ مجھے تم لوگوں سے بہت ہلکی پھلکی باتیں کرنی چاہئیں۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ تم لوگ تو اچھے بھلے دانشور ہو۔ ہر مسئلے پر تمہاری نظر ہے، ایک رائے ہے۔ میں شہر کے ہنگاموں اور قتل و غارت گری سے بہت مایوس تھا۔ لیکن تم دونوں سے مل کر میرا دل امید اور خوشی سے بھر گیا ہے۔ تم جیسے ذہین اور سوچنے والے بچے ہمارے درمیان ہیں تو پھر مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ وقت جیسے جیسے گزرے گا۔ حالات بہتر ہوں گے۔ ہمارا ملک بہت ترقی کرے گا .... اور اس کی وجہ تم جیسے ذہین بچے ہوں گے۔ کیا تم دونوں بتانا پسند کرو گے کہ مستقبل میں تم لوگوں کے ارادے کیا ہیں؟"

"بہت شکریہ انکل! آپ نے اتنی تعریف کی۔" رافع نے کہا: "میں انجینئر بننا چاہتا ہوں۔"

"اور میں بھی انجینئرنگ ہی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں۔" نوشین نے کہا۔

"مگر تم دونوں انجینئر کیوں بننا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ انجینئر تعمیر کرتے ہیں۔" نوشین نے کہا۔

"اور ہمیں بھی یہ ملک نئے سرے سے تعمیر کرنا ہے۔" رافع نے کہا اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں روشنی تھی۔ ہمارے مستقبل کی روشنی!!!

اصلاح کا طریقہ

مشہور ولی حضرت حاتم اصمؒ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہرے تھے۔ ایک روز ان کے قریب ایک مکھی مکڑی کے جالے میں پھنس گئی اور بھنبھنانے لگی۔ حضرت حاتمؒ نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "لالچی مکھی! ہر جگہ شکر، شہد اور قند نہیں ہوتا۔ بہت سے گوشوں میں پھندا اور جال بچھا ہوتا ہے۔" مکھی اڑ گئی۔ لوگوں نے حضرت حاتمؒ سے پوچھا۔ "حضور! آپ نے مکھی کی بھنبھناہٹ کیسے سن لی؟ آپ تو بہرے ہیں۔" حاتم اصمؒ مسکرائے۔ "بھائی! میں حقیقت میں بہرا نہیں ہوں لیکن بہرا بنا رہتا ہوں تاکہ لوگ میرے سامنے میرے عیب بیان کریں اور میں اپنے عیبوں پر قابو پا سکوں۔"

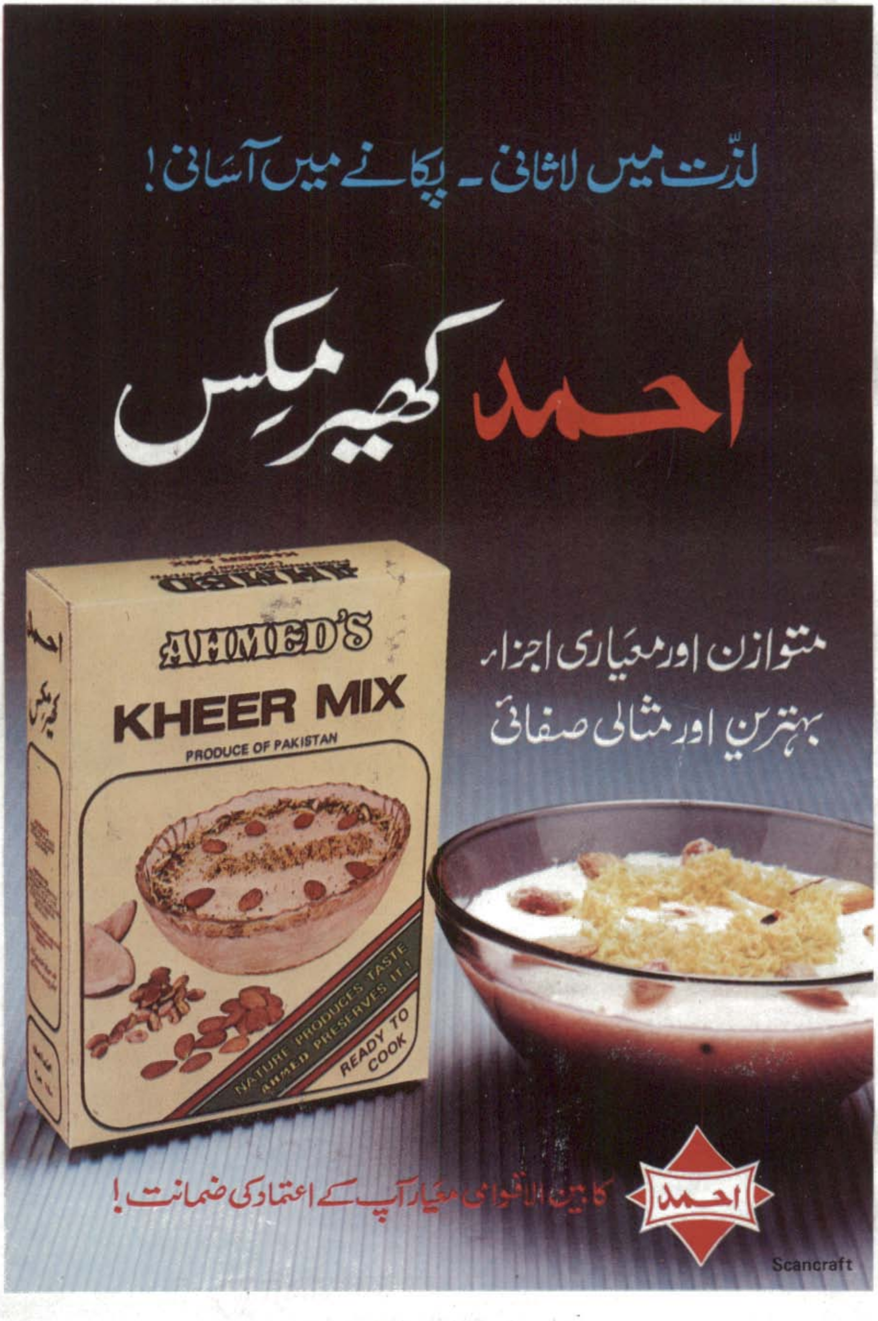
لذّت میں لاثانی ۔ پکانے میں آسانی !
احمد کھیرِ مکس
AHMED'S
KHEER MIX
PRODUCE OF PAKISTAN
NATURE PRODUCES TASTE
AHMED PRESERVES IT!
READY TO COOK
متوازن اور معیاری اجزاء
بہترین اور مثالی صفائی
احمد
کا بین الاقوامی معیار آپ کے اعتماد کی ضمانت !
Scancraft

دیکھیں ذہن کو کر کے حاضر   دنیا کے دلچسپ مناظر

کام چور کدّو کو
اتنا موٹا
ہونا تھا

دو ہزار سے زیادہ شادیوں کا اک منظر

لوکیوں کی لمبائی
دیکھ کر
ہنسی آئی

تصویر دیکھ کر کے، یہ سوچئے ذرا سا
شہرت کا شوق ہم سے کروائے کام کیا کیا؟

امریکہ کی دریافت کی پانچسو ویں سالگرہ پر
کولمبس کے جہاز کی شکل کا ایک جہاز بنا کر اُڑایا گیا

کھٹے میٹھے

ماہِ رواں کے منتخب لطائف

انعامی لطیفہ

ایک دفعہ ایک جن ایک بچے کے پاس گیا اور اسے ڈرانے لگا بچے نے معصومیت سے پوچھا "تم کون ہو۔" جن نے کہا، "میں جن کا بچہ ہوں"

بچے نے فوراً کہا، "اچھا تو مسجد میں تمہارا ہی اعلان ہو رہا تھا کہ، "جن کا بچہ ہو آکر لے جائیں۔"

سید واصف اسلم۔
نواب شاہ

ایک غائب دماغ پروفیسر کہیں جارہے تھے کہ راستے میں انہیں ان کا بیٹا مل گیا۔ بیٹے نے سلام کیا تو پروفیسر صاحب کھسیانے ہو کر بولے "وعلیکم السلام بیٹا کہو تمہارے باپ کا کیا حال ہے؟"

یاسمین ناز۔ کراچی

نماز پڑھنے کے بعد ایک نوّے سالہ شخص روزانہ یہ دعا مانگتا تھا۔

"باری تعالیٰ! میں بڑا گناہ گار ہوں میں جنت میں جانے کا مستحق نہیں، مجھے اسی دنیا میں رہنے دے۔

عبدالقیوم فتح محمد قریشی...... حیدر آباد

وکیل:۔ آپ وہ الفاظ دہرائیں جو ملزم نے آپ سے کہے تھے۔

مدعی:۔ جناب! وہ شریف آدمی کے سامنے نہیں کہے جاسکتے۔

وکیل:۔ ٹھیک ہے آپ وہ الفاظ جج صاحب کے کان میں کہہ دیں۔

نوید اختر...... کراچی

پاگل خانے میں ایک مریض نے ڈاکٹر سے کہا "ہم آپ کو پچھلے ڈاکٹر کی نسبت زیادہ پسند کرتے ہیں" نیا ڈاکٹر (خوش ہوتے ہوئے) "مگر وہ کیوں"؟ مریض :۔ "چونکہ آپ ہم میں سے ہی ایک لگتے ہیں۔"

جنید اختر...... کراچی

مالک :(کرایہ دار سے) اگر مکان کرایہ پر لینا ہے تو پگڑی دو۔

کرایہ دار :(بے چارگی سے) مگر قبلہ محترم میں تو ٹوپی پہنتا ہوں پگڑی کہاں سے دوں۔

گلشن کمار پروانہ ...... مستونگ

ایک دفعہ ایک سیاح کسی گاؤں میں گیا اور ایک دیہاتی سے پوچھا "یہاں پر کوئی بڑا آدمی پیدا ہوا ہے؟" دیہاتی نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ "نہیں جناب یہاں پر تو ہمیشہ بچے ہی پیدا ہوتے ہیں"۔

مرسلہ زاہد احمد قاضی ...... روہڑی

حیدر نیا نیا بیج کارپوریشن کا افسر تعلقات عامہ بنا تھا اس کی ڈیوٹی تھی اخبارات میں بیجوں اور کارپوریشن کے حوالے سے جتنی خبریں آئیں سب کو فائل کی صورت میں مینیجنگ ڈائریکٹر کو پیش کرے، پہلے دن جو فائل پیش کی گئی اس کی پہلی خبر تھی۔ روس افغانستان میں نفرت کے بیج بونے کی کوشش کر رہا ہے۔

محمد اکرم سیالوی ...... ننکانہ صاحب

کہیں اماں نہ ملی میرے آشیانے کو

ایک کنجوس آدمی اپنے ملازم کی کسی بات پر خوش ہو کر اسے انعام دینے کا وعدہ کر بیٹھا مگر بعد میں بڑا پچھتایا اور جب بھی ملازم سے سامنا ہوتا وہ اپنی گردن پھیر لیتا۔ ایک روز گلی سے اونٹ گزر رہا تھا اسکی گردن ٹیرھی تھی۔ آقا نے ملازم سے پوچھا کہ اس کی گردن کیوں ٹیرھی ہے۔ ملازم نے کہا، "اس نے بھی کسی کو انعام دینے کا وعدہ کیا ہو گا"۔

شازیہ عزیز کراچی

ایک دفتر کے باس نے سوچا کہ کمپنی کے کام کا جائزہ لیا جائے کہ کیا کام ہو رہا ہے۔ وہ فوراً اٹھے۔ اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ ایک کلرک سے پوچھا۔ "آپ کب سے کام کر رہے ہیں۔"

"جب سے آپ یہاں داخل ہوئے ہیں۔" کلرک نے جواب دیا۔

مرسلہ طارق عباسی۔ راولپنڈی

ایک ٹی وی کی اناؤنسر کے گھر پارٹی ہوئی۔ جب کھانا لگ گیا تو موصوفہ مہمانوں میں پہنچیں اور جھک کر بولیں۔

"یہ کھانا آپ کی خدمت میں اللہ تعالیٰ کے تعاون سے پیش کیا جا رہا ہے۔"

کامران میر...... لیہ

ٹنی اپنے دوست کو بتا رہا تھا۔ "میرا بایاں بازو درد کر رہا تھا اور دایاں پاؤں تو تکلیف سے اٹھ نہیں رہا تھا۔ میری گردن اکڑی ہوئی تھی اور کمر میں بھی درد تھا۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا اس نے ربڑ کے ہتھوڑے سے میرے گھٹنے پر ہلکی ضربیں لگائیں۔" "اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟" دوست نے پوچھا "اب میرا گھٹنا بھی درد کرنے لگا ہے۔" جواب ملا۔

روبینہ ناز...... مخدوم پور بہوڑاں

ماسٹر صاحب نے بچوں سے سوال کیا کہ "میں جواں ہوں۔ یہ کونسا فعل ہے۔"

شاگرد نے جواب دیا "ماضی۔"

"استاد وہ کیسے؟"

شاگرد۔ وہ اس لئے کہ آپ کی جوانی کا وقت گذر چکا ہے۔"

مرسلہ۔ افشاں مجید شیخ...... سکھر

جج۔ (ملزم سے) "تم نے پانی میں زہر ملا کر مقتول کو کیوں دیا۔"

ملزم۔ "جناب اس۔ نے خود بولا کہ پانی ایسا ہو جو مجھے ٹھنڈا کر دے۔" محمود محمد اشرف...... کراچی

جب کچھ بن نہ پڑے .....

حادثے میں زخمی ہونے والے ایک شخص کو ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹر نے اس کے مرہم پٹی کے بعد کہا کہ کل تم گھر چلے جانا۔ مگر اگلے دن ہی ڈاکٹر آکر کہنے لگا "تمہیں ایک ماہ تک یہاں رہنا ہو گا مجھے آج اخبار میں حادثے کی تفصیلات پڑھ کر تمہارے زخموں کی شدت کا اندازہ ہوا ہے۔"

حسن مہدی خراسانی ...... کراچی

ایک آدمی مولوی صاحب کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ "حضرت مجھے کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ کھاؤں پیوں بھی اور میرا روزہ بھی نہ ٹوٹے۔" مولوی حاضر جواب تھے فوراً بولے "جائیے اور کسی ہٹے کٹے آدمی کو پکڑ لیجئے مار کھائیے، غصہ پیجئے روزہ بالکل نہیں ٹوٹے گا۔" مرسلہ۔ اعجاز شیخ...... سکھر

کسی شاعر نے فارسی کے مشہور شاعر مولانا جامی کو اپنی غزل سنائی۔ پھر کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ اس غزل کو خوشخط لکھوا کر شہر کے بڑے دروازے پر لٹکا دیا جائے تاکہ گزرنے والوں کی نگاہ پڑے اور غزل خوب مشہور ہو جائے۔" مولانا نے فرمایا "اور بہتر ہے کہ شاعر کو بھی غزل کے ساتھ ہی لٹکا دیا جائے۔" مرسلہ۔ محمد دانش...... سکھر

بلا عنوان

ریڈیو پر قوالی آرہی تھی۔ قوال کی آواز گراں تھی اور لگ رہا تھا کہ گا نہیں رہا بلکہ رو رہا ہے۔ منّے نے جلدی سے ریڈیو بند کر دیا۔ امی نے وجہ پوچھی تو منے نے معصومیت سے جواب دیا۔ "آپ ہی تو کہتی ہیں۔ روتے ہوئے کو چپ کرانا ثواب کا کام ہے۔"

محمد آصف ذکریا

ایک دوست (دوسرے سے) میرے پاس ایک ایسا پنکھا ہے جو بغیر بجلی کے چلتا ہے۔

دوسرا دوست (حیرت سے) "بھئی یہ تو کمال کا پنکھا ہے۔"

پہلا (چونک کر) نہیں یہ تو مرا پنکھا ہے۔

شمس الحق ...... کراچی

ایک خونخوار قبائلی اپنی نئی نویلی دلہن کو گھوڑے پر بٹھائے گھر جا رہا تھا راستہ بہت خراب تھا ایک جگہ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی تو قبائلی نے کہا "پہلی غلطی سنبھل کے۔ گھوڑے نے پھر ٹھوکر کھائی تو قبائلی نے اسے وارننگ دی اور جب گھوڑے نے تیسری ٹھوکر کھائی تو قبائلی نے گھوڑے کو شوٹ کر دیا۔ دلہن یہ دیکھ کر حیران رہ گئی اور کہا "کتنے ظالم ہو تم"۔ قبائلی نے گھورتے ہوئے کہا۔ "پہلی غلطی سنبھل کے"۔

شازیہ غفار ...... کراچی

"کیا آپ کے موزوں میں سوراخ ہے؟" اشرف نے ہم سفر سے پوچھا۔

"جی نہیں، ہر گز نہیں میرے موزوں میں سوراخ نہیں ہے۔"

"پھر آپ نے موزوں میں پاؤں کیسے ڈالے؟" اشرف نے حیرت سے پوچھا۔

محمد اختر ...... حیدر آباد

دو افیمی جا رہے تھے اچانک ایک افیمی بولا۔ "یار وہ کون آرہا ہے۔" دوسرے نے جواب دیا۔ "میری بھابی کا شوہر ہے۔" "اوہ میں شاید سمجھا کہ شاید تمہارے والد کا لڑکا ہے۔" پہلے نے اطمینان سے جواب دیا۔

مرسلہ۔ اعجاز علی شیخ ...... سکھر

استاد۔ خوش آمدید کے کیا معنی ہے۔

شاگرد۔ جناب آم دیکھ کر خوش ہونا۔

مرسلہ ایم اسلم خان ...... مظفر گڑھ

ستمبر ۹۰ءسے "کھٹے میٹھے" کی جگہ موضوعاتی لطائف کا نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ ستمبر کا موضوع ہے "اسکول"۔ اس موضوع پر اگر آپ کو کوئی بھی دلچسپ لطیفہ یاد ہو تو جلدی سے بھجوا دیجئے

یاد رکھئے۔ اکتوبر کی اشاعت کے لئے ہمارا موضوع ہے "ڈاکٹر"

پیامِ سحر

نذیر پارس

بکھرنے لگا نور بھاگا اندھیرا
چلو چھوڑ دو بستر ہُوا ہے سویرا
سنو پیڑ پہ پنچھیوں کی صدائیں   کریں اپنے خالق کی حمد و ثنائیں
گجر دے رہا ہے یہ پیغام ہم کو   حقیقت کی دُنیا میں خوابوں سے آئیں
عجب رنگ فطرت نے ہر سو بکھیرا
چلو چھوڑ دو بستر ہُوا ہے سویرا
ہے یہ جو کہ سُستی و غفلت تمہاری   نہیں اچھی ہرگز یہ عادت تمہاری
کرو علم حاصل اسی سے ہی ہوگی   زمانے میں عزّت و شہرت تمہاری
نہیں اچھا غفلت کا دل میں بسیرا
چلو چھوڑ دو بستر ہُوا ہے سویرا
کرو ناشتہ اور اسکول جاؤ   اٹھو محفلِ علم کو اب سجاؤ
یہی وقت ہے زندگی کو بناؤ   بڑا قیمتی ہے نہ اِک پل گنواؤ
تمہیں کن خیالوں نے پارس ہے گھیرا
چلو چھوڑ دو بستر ہُوا ہے سویرا

چیونٹی کو بھی حقیر نہ جانو

رفعت ہمایوں

جنگل میں بہار آئی ہوئی تھی، پرندے چہچہا رہے تھے۔ بندروں کے بچّے اپنے کھیل میں مگن تھے، وہ کبھی درختوں پر چڑھتے، چھپ جاتے اور پھر ایک دوسرے کو ڈھونڈ نکالتے۔ ننھی کوئل درخت پر بیٹھی میاں بگلے کو منہ چڑا رہی تھی۔

آج میاں لومڑ کی چھٹی تھی۔ انہوں نے جنگل کا موسم دیکھا تو جی میں آئی کہ سیر کو چلیں۔ میاں بھالو کے گھر آئے اور دستک دی، تو میاں بھالو نے دروازہ کھولا۔ وہ تو پینٹ شرٹ پہنے تیار کھڑے تھے۔ ”ارے بھئی کہاں چلے“؟ میاں لومڑ حیرت سے بولے۔ ”ذرا ماموں بھیڑیئے کے گھر تک جا رہا ہوں سوچا آج کا موسم خوب ہے ذرا جنگل کی سیر کی جائے“۔ میاں بھالو بولے ”ارے میں بھی اسی خیال سے آیا ہوں“۔ لومڑ میاں خوشی سے چلّائے۔ ”چلو کچھ کھانے پینے کا سامان باندھ لو، میں راستے ہی سے کچھ پھل توڑ لایا ہوں“، جب تک میاں بھالو نے سامان باندھا تب تک میاں لومڑ اپنی

خوبصورت دُم پر کنگھی کرتے رہے۔

خیر صاحب دونوں خوشی خوشی ماموں بھیڑیئے کی طرف چلے کہ راستے میں انہیں ایک بہت ہی سریلی سی آواز سنائی دی۔ کوئی خوبصورت سی آواز میں بہار کے گیت گا رہا تھا۔ "یہ کون ہے"؟ بھالو میاں حیران ہو گئے۔ "یہ پرندوں کا بادشاہ ہے بہت خوبصورت آواز میں گاتا ہے" لومڑ میاں نے بتایا۔ "ارے؟ اس کی تو میں نے بھی بڑی شہرت سنی ہے کہاں رہتا ہے"؟ اتنے میں اس درخت سے کچھ پرندے پھڑ پھڑاتے ہوئے اُڑے ان ہی میں نیلے اور گلابی پروں والا خوبصورت چڑیوں کا ایک جوڑا بھی تھا، جن کے سروں پر ننھے منّے سنہری تاج بھی تھے۔ بھالو میاں دیکھ کر حیران رہ گئے اور مچل گئے کہ چلو پرندوں کا محل دیکھیں۔ "ارے یہ ویسا محل تھوڑے ہی ہے جیسا تم سمجھ رہے ہو۔ چھوڑو یار کہیں ماموں بھیڑیئے گھر سے نہ نکل پڑیں۔" لیکن میاں بھالو کو جب کسی چیز کی ضد چڑھ جاتی تھی تو بس وہ اس پر اُڑ جاتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اس درخت پر پرندوں کے بادشاہ کا محل ہے۔ خیر میاں لومڑ نے عقل سے کام لے کر بڑی بڑی مشکلوں سے بھالو میاں کو درخت پر چڑھایا، وہاں انہوں نے گھاس پھونس اور تنکوں کا بنا ہوا ایک عجیب سا گھونسلا دیکھا تو خوب ہنسے، اس میں ننھے منے چھوٹے چھوٹے بچے چوں چوں کر رہے تھے۔ "ارے یہ محل ہے؟ بھلا ایسے محل ہوا کرتے ہیں بادشاہوں کے؟ اور یہ بچے کتنے بدہیئت لگ رہے ہیں، نہ تو ان کے پر ہیں ڈھنگ کے اور نہ ہی ان کی آنکھیں ڈھنگ سے کھلی ہوئی ہیں اور یہ مُنا بچّہ تو مجھے بالکل بٹیر لگ رہا ہے"۔ بچوں نے غصّے سے گھور کر میاں بھالو کو دیکھا، پھر سب سے مُنا بچّہ اتنی زور سے چلّایا کہ بھالو میاں ڈر کر درخت سے اتر گئے۔

لیکن اس کے باوجود میاں بھالو نے اس درخت کے نیچے کھڑے ہو کر نہ صرف پرندوں کے بادشاہ کا، ملکہ کا، اس کے گھر کا بلکہ اس کے ننھے منّے بچّوں کا بھی خوب مذاق اڑایا اور یہ بات بچّوں کو بہت بُری لگی اور وہ منہ لپیٹ کر پڑ گئے، جب بادشاہ اور ملکہ دانہ دنکا چگ کر واپس آئے تو بچوں کی ننھی منی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ بچّوں نے نہ صرف کچھ کھانے سے انکار کر دیا بلکہ منہ سے بھی کچھ نہ پھوٹے، آخر بڑی بڑی منتّوں کے بعد انہوں نے بتایا کہ کس طرح میاں بھالو آئے تھے اور ان کا، ان کے گھر کا اور ان کے امی پاپا کا مذاق اڑا کر چلتے بنے، لہٰذا جب تک ان کو سزا نہیں دی جائے گی وہ کچھ نہیں کھائیں گے۔ بچوں کی یہ شرط بہت کڑی تھی آخر وہ ماں باپ تھے اور پھر ملکہ کو بھی بہت برا لگا اس نے بھی بچوں کی حمایت کی اور بادشاہ سے کہا کہ "آخر کو تم بادشاہ ہو، زمانہ کیا کہے گا کہ ایک معمولی سا بھالو بادشاہ کے بچوں کا اس کے گھر کا اور خود اس کا مذاق اڑا کر چلتا بنا اور بادشاہ سلامت بس دیکھتے رہے گئے"۔ تو بادشاہ سلامت نے بھی سوچا کہ بات تو صحیح ہے جب ان کی رعایا کو

پتہ چلے گا تو وہ بُرا اثر لے گی، لہٰذا وہ فوراً اپنے مصاحبوں کے ساتھ بھالو میاں کے گھر گئے اور اتنی زور سے چلّائے کہ بھالو میاں ڈر کر اور اندر دبک گئے۔ بادشاہ سلامت نے اعلان جنگ کرتے ہوئے کہا کہ "سن لو کل بڑے میدان میں دریا کے کنارے دوپہر کو ہمارا مقابلہ ہو گا اور ہم تم کو تمہارے کئے کی سزا دیں گے ورنہ خیریت اس میں ہے کہ تم ہم سے اپنے کئے کی معافی مانگ لو"۔ مگر میاں بھالو کی غیرت کو بھی جوش آگیا کہ بھلا یہ مُنا سا پرندہ بادشاہ اور اس کی رعایا ہمارا کیا بگاڑ لے گی۔ لہٰذا وہ وہیں سے دبکے دبکے چلّائے کہ بھئی ہم تو جنگ کرنے کو تیار ہیں تم بھی اپنے لوگوں کو لے آؤ۔ بادشاہ سلامت کے رخصت ہوتے ہی بھالو میاں اپنی پینٹ سنبھالتے ہوئے میاں لومڑ کے پاس پہنچے اور جلدی جلدی سارا ماجرا کہہ سنایا۔ میاں لومڑ ان کی پریشانی پر مسکرائے اور پھر انہوں نے جو ترکیب بتائی وہ سن کر میاں بھالو عش عش کر اٹھے۔ میاں لومڑ نے جنگل کے سارے بڑے بڑے جانوروں کو شام کی چائے پر بلایا۔ ہاتھی، شیر، گیدڑ، بھیڑیئے، باگڑ بلے سبھی جمع ہوئے۔ پھر میاں لومڑ نے ایک زور دار تقریر کی اتنی جوشیلی تقریر کی۔ کہ سارے درندے، پرندوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ادھر پرندوں کے ہاں بھی تیاریاں جاری تھیں۔ بی فاختہ نے اپنے آپ کو پیش کر دیا کہ اگر صلح صفائی کی نوبت آئی تو میں حاضر ہوں۔ ہدہد نے اپنی لمبی چونچ کا ہدیہ پیش کیا۔ میاں مٹھو نے اپنی دائیں آنکھ پیش کر دی کیونکہ بائیں آنکھ سوجی ہوئی تھی، وہ جب مٹی سے کھیل رہے تھے تو ایک ذرہ ان کی آنکھ میں پڑ گیا تھا۔ بہرحال عقاب کو تو چھوٹی پہاڑی کی چوٹی پر بٹھا دیا گیا اور کوئل کو مخبری کے لئے روانہ کر دیا۔

ادھر میاں بھالو شیر بنے اِدھر سے اُدھر اکڑے اکڑے پھر رہے تھے۔ جنگی تیاریوں کے بعد قافلہ میدان جنگ کی طرف چلا تو میاں بھالو نے کہا باقی سب تو ٹھیک ہے مگر خطرے کے لئے تو ہم نے کوئی اشارہ نہیں بنایا تو میاں لومڑ نے جھٹ اپنی دُم پیش کر دی۔ کہنے لگے بھئی میری دُم خوب گھنی، سرخ اور لمبی ہے۔ میں سب سے آگے آگے دُم کھڑی کر کے چلوں گا تم سب پیچھے پیچھے آنا، جب میری دُم نیچے ہوگی تو سمجھ لینا کہ خطرہ ہے اور پھر تم سب بھاگ جانا۔ بہادر اور عقلمند لومڑ کی بات سے سبھی نے اتفاق کیا اور ان کی قربانی اور بہادری یعنی پیش قدمی پر سب نے ان کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ درختوں کے پتّوں میں چھپی ہوئی جاسوس کوئل ان کی گفتگو سن رہی تھی وہ بھاگی بھاگی بادشاہ سلامت کے پاس گئی اور ساری رپورٹ پیش کر دی۔ بادشاہ نے فوراً ایک ہرکارہ شہد کی مکھیوں کی سلطنت میں ایک بھڑ کے علاقے میں اور ایک تتیّوں کی طرف دوڑایا۔ وہ بادشاہ کا حکم سن کر اپنا اپنا لشکر لے کر حاضر ہو گئے، ادھر ایک لشکر چونٹیوں کا بھی شور مچاتا آگیا۔ لیکن بادشاہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا سب خاموش ہو

گئے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ سب سے زیادہ زہریلا ڈنک کس کا ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی بولی "تتیّا بہت زور سے ڈنک مارتا ہے۔" خیر طے یہ ہوا کہ تتیّا کسی طرح چوری چھپے جا کر لومڑ کی گھنی دم میں چھپ کر بیٹھ جائے اور جب دشمنوں کا لشکر تھوڑی دور رہ جائے تو پھر وہ اپنا کام شروع کر دے۔ تتیّا فوراً چھپتا چھپاتا گیا اور چپکے سے لومڑ کی دم میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ نقارچی ہاتھی نے اپنی سونڈ اٹھا کر اعلان جنگ کیا اور پھر سارے بھاری بھرکم جانور لومڑ کی قیادت میں ڈھول اڑاتے زمین پر پاؤں مارتے میدان جنگ کی طرف چلے۔ تتیّے نے اپنا کام شروع کر دیا۔ دوسری طرف سارے پرندے درختوں کی شاخوں پر اور زمین پر دم سادھے تیار بیٹھے تھے۔

تتیّے نے پہلا ڈنک مارا لومڑ برداشت کر گیا تتیّے نے دوسرا ڈنک مارا لومڑ کی دُم ہل گئی لیکن وہ پھر بھی آگے آگے اپنی دم اٹھائے چلتا رہا۔ لیکن جیسے ہی تتیّے نے تیسری دفعہ بہت زور سے ڈنک مارا تو اس نے ایک زور کی چیخ ماری اور دُم نیچی کر کے زمین پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ دم کا نیچا کرنا تھا کہ سارے جانور بدحواس ہو کر اوندھے سیدھے بھاگے۔ گیدڑ بھالو سے جا ٹکرایا، گینڈے کی سینگ ہاتھی کو لگی اور میاں لومڑ بھیڑیئے کے پیٹ میں جا گھسے۔ اتنے میں پرندوں کے بادشاہ نے ایک سیٹی بجائی اور سارے پرندے بلبل، فاختہ، ہدہد، بگلے، کوئے، طوطے، شہد کی مکھیوں، بھڑوں اور تتیّوں نے مل کر چاروں طرف سے ہلہ بول دیا۔ زمین پر چیونٹے چیونٹیاں پاؤں میں کاٹ رہے تھے۔ غرض ہر طرف عجیب ہڑبونگ مچی ہوئی تھی اور سارے جانور میدان چھوڑ کر بھاگ لئے اور یوں جنگ اختتام کو پہنچی۔ فتح کے بعد بادشاہ خوش خوش گھر پہنچا، مگر بچوں کا موڈ اب بھی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ ان کا اصرار یہ تھا کہ جب تک میاں بھالو خود آکر ان سے معافی نہیں مانگیں گے وہ نہیں مانیں گے۔ خیر صاحب بادشاہ سلامت میاں بھالو کے گھر گئے اور زور سے بولے "اگر تم نے ہمارے بچوں سے معافی نہیں مانگی تو ہم تم پر دوبارہ ہلہ بول دیں گے"۔ میاں بھالو کے سامنے اپنی شکست کی مثال تھی اور پھر میاں لومڑ کا بھی پتہ نہیں تھا۔ دوسرے بڑے بڑے جانور مارے شرمندگی کے منہ چھپائے پڑے تھے۔ وہ ہانپتے کانپتے گھر سے باہر نکلے اور درخت کے نیچے کھڑے ہو کر انہوں نے درخت کے تنے پر اپنی ناک سے سات لکیریں کھینچی اور بچوں سے کان پکڑ کر معافی مانگی کہ آئندہ وہ کسی کا مذاق نہیں اڑائیں گے، تو بچّوں نے انہیں معافی دے دی اور بچّے پھر خوشی خوشی چوں چوں کرنے لگے اور دانہ دنکا کھانے لگے، بے چارے کل سے بھوکے جو تھے، اسی لئے تو بزرگوں نے کہا ہے کہ کسی کو بھی حقیر نہ جانو، چیونٹی بھی دب کر کاٹ لیتی ہے۔

کراچی کا نام

کراچی کیسے پڑا

سیّد نظر زیدی

۱۹۴۷ء میں ہمارا پیارا وطن پاکستان قائم ہوا تو اس کا پہلا دارالحکومت بننے کی عزت کراچی شہر کو ملی۔ اس سے پہلے اسی شہر کو یہ عزت بھی حاصل تھی کہ حضرت قائداعظم محمد علی جناح اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے اور ابتدائی تعلیم بھی اسی میں حاصل کی تھی۔ اب ان کا مزار بھی اسی میں ہے۔

خدا کے فضل سے کراچی اب دنیا کے ان بہت بڑے شہروں میں شامل ہے جنہیں بہت زیادہ آبادی کی وجہ سے بڑا مانا جاتا ہے۔ پاکستان کا دارالحکومت بننے سے پہلے بھی کراچی کو ہندوستان کا بہت خوبصورت اور صاف ستھرا شہر مانا جاتا تھا۔ اب تو ماشا اللہ اس کی شان اور خوبصورتی بہت ہی بڑھ گئی ہے۔

خوبصورتی اور شان کے علاوہ پاکستان کا یہ عظیم شہر تجارت کے لحاظ سے بھی بہت بڑا ہے۔ دنیا کے دوسرے براعظموں سے جو ہوائی اور سمندری جہاز تجارت کا سامان لے کر آتے ہیں اس کی بندر گاہ اور ہوائی اڈے پر ٹھہرتے ہیں۔ تجارت کا جو سامان ہوائی اور سمندری جہازوں کے ذریعے باہر کے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے وہ بھی کراچی بندر گاہ اور کراچی کے ہوائی اڈے سے روانہ کیا جاتا ہے۔

کراچی کا نام کراچی کیوں پڑا؟ اس کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے پہلے اس جگہ سمندر سے مچھلیاں پکڑنے والوں کی ایک چھوٹی سی بستی آباد تھی جس کا نام کلاچی تھا۔ یہی نام بدل کر کراچی ہو گیا' لیکن یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ بس یونہی مشہور ہو گئی ہے۔

اصل اور سچّی بات یہ ہے کہ یہ شہر اس زمانے میں بسایا گیا تھا جب کم عمر عرب سپہ سالار محمدؒ بن قاسم نے سندھ فتح کیا تھا اور یہ قریب قریب اسی جگہ آباد ہوا جس جگہ سندھ کا پرانا دارالحکومت شہر دیبل

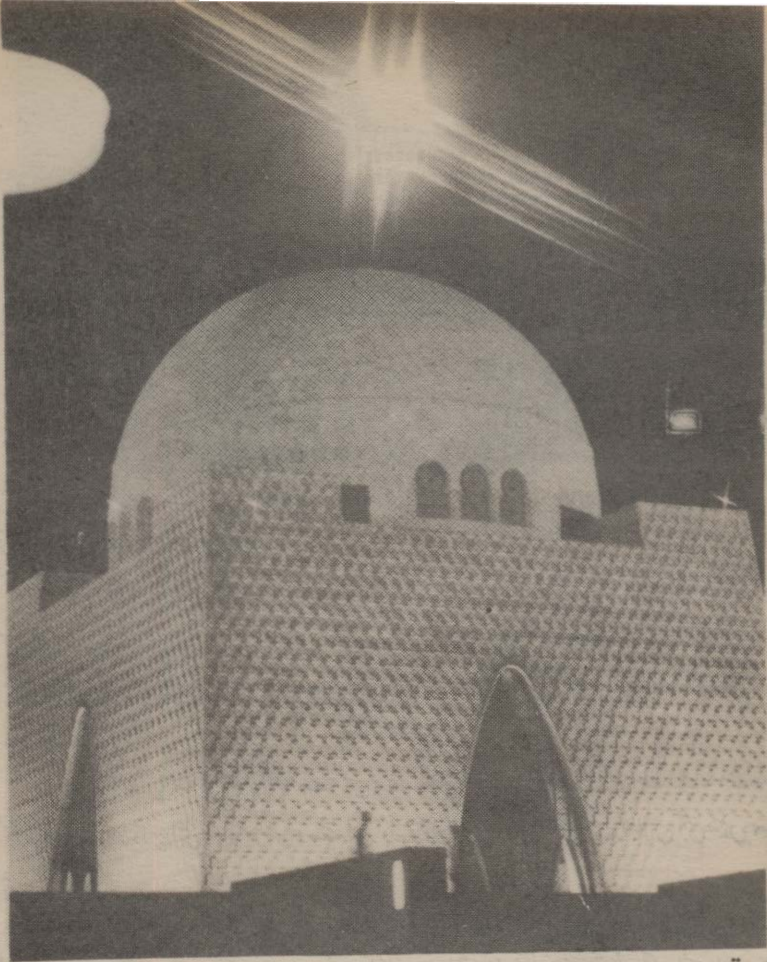

آباد تھا۔

یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہو گئی ہے کہ راجہ داہر کا دارالحکومت شہر دیبل اس جگہ آباد تھا جہاں اب کراچی کا منوڑا ہے۔ ہوا یہ کہ جب محمدؒ بن قاسم نے راجہ داہر کو شکست دے کر سندھ میں پہلی اسلامی حکومت قائم کی تو دیبل شہر میں قریش قبیلے کے کئی ہزار فوجیوں اور سوداگروں کو بسایا اور ان عربوں کو یہاں آباد ہونے کی وجہ سے لوگ دیبل کو قریش یا قریشی کہنے لگے۔ اور آگے چل کر یہ نام کراشی ہو گیا اور پھر کراشی سے کراچی بن گیا۔

اردو زبان کے مشہور مصنف سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم نے اپنی کتاب "تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت" کی دوسری جلد میں صفحہ ۶۳۷ اور ۶۳۸ پر کراچی کے نام کے بارے میں یہ سب باتیں لکھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مشہور انگریز مصنّف سر ہنری ایلیٹ نے بہت تحقیق کے بعد کراچی کے نام کے بارے میں

یہی بتایا ہے کہ عربوں کے قریش قبیلے ہباری اور تمیم وغیرہ دیبل میں آباد ہوئے توان کی وجہ سے یہ شہر قریش یا قرشی کہلانے لگا اور یہی نام بدل کر کراچی ہوگیا۔

ہاشمی صاحب کا کہنا ہے سر ہنری ایلیٹ کے علاوہ مشہور ترک امیرالبحر سیّدی علی نے بھی اپنی کتاب "محیط" میں کراچی کے نام کے بارے میں یہی لکھا ہے۔ سیّدی علی اپنے سمندری جہاز لے کر یہاں آیا تھا۔ اس نے اس علاقے کے بارے میں اور بہت سی باتیں لکھنے کے علاوہ کراچی کے نام کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا ہے۔

کراچی اب پاکستان کا دارالحکومت نہیں ہے۔ لیکن صوبہ سندھ کا دارالحکومت ہے۔ سندھ کے گورنر صاحب اور وزیر اعلیٰ اسی شہر میں رہتے ہیں اور قانون بنانے والی اسمبلی کے اجلاس بھی یہیں ہوتے ہیں۔

خدا کے فضل اور پاکستان کی برکت سے کراچی کی شان، خوبصورتی اور خوشحالی پہلے سے ہزاروں گناہ بڑھ چکی ہے۔ اسے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کا بہت بڑا شہر مانا جاتا ہے اور یقیناً یہ ایک ایسی بات ہے کہ سب پاکستانیوں کو اپنے اس عظیم شہر پر فخر کرنا چاہئے۔

کراچی کے بارے میں یہ مضمون لکھتے ہوئے ہم بھی بہت خوشی اور فخر محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ خیال بھی آرہا ہے کہ کراچی کی خوشحالی، شان اور خوبصورتی کی وجہ سے جہاں ہمیں یہ عزت حاصل ہوئی ہے کہ لندن (پیرس) واشنگٹن اور ماسکو وغیرہ دنیا کے مشہور شہروں کا رعب ہمارے دلوں سے مٹ گیا ہے اور ہم سر اونچا کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی تو کراچی اور لاہور جیسے شاندار شہر موجود ہیں، وہاں ہمارے اوپر یہ ذمہ داری بھی آپڑی ہے کہ اپنے ان خوبصورت شہروں کو اور خوبصورت بنانے اور ان کی آزادی کی حفاظت کرنے کی بھی کوشش کرتے رہیں۔ کیوں بھئی! یہ بات ضروری ہے نا؟

فطرت کی دنیا

مستقل سلسلہ

بدلتے مناظر

شین فاروقی

انسان اور جنگل کا تعلق بہت پرانا ہے۔ بستیوں کے آباد ہونے سے قبل انسان جنگلوں ہی میں رہتا بستا تھا۔ اگرچہ اب انسان کا جنگل سے براہ راست تعلق ختم ہو چکا ہے مگر انسان آج بھی جنگل پر انحصار کرتا ہے۔

جنگلات کسی بھی ملک کی آب و ہوا، معاشی ترقی اور قدرتی حسن میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ گزشتہ بیس پچّیس برسوں سے دنیا بھر میں بڑے پیمانے پر جنگلات کو کاٹنے کا سلسلہ جاری ہے۔ جس کے ماحول پر بہت بُرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس بار "فطرت کی دنیا" کے اس سلسلہ میں ہم آپ کو یہی بتائیں گے کہ جنگلات کے کٹنے اور جھیلوں کے سوکھنے سے ہماری زمین کا منظر کیوں اور کس طرح تبدیل ہوتا ہے۔؟

آپ نے مشاہدہ کیا ہو گا کہ ہماری زمین مختلف قسم کے پیڑ اور پودوں اور پھولوں سے لدی پھندی رہتی ہے اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان پیڑ پودوں میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کیا کیا تبدیلیاں آتی ہیں۔؟ بہت سے پیڑ پودے سردیوں میں پتّیوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ جب کہ گرمی آتے ہی ان پر دوبارہ پتّیاں آجاتی ہیں۔ اسی طرح جنگلی پودے گرمی کے موسم میں پھولوں سے خوب بھر جاتے ہیں اور جیسے ہی سردی آتی ہے ان کے پھول غائب ہو جاتے ہیں۔ البتہ کچھ پیڑ پودے بہت ہی معمولی تبدیلی سے گزرتے ہیں۔ گھاس کے پودے بھی تبدیلی کے عمل سے گزرتے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر پودے مرجاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے پودے پیدا ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم مستقبل میں جھانکیں اور آج سے بیس برس بعد کسی دیہی علاقے کو دیکھیں تو شاید ہمیں لگے کہ اس میں بہت تبدیلی نہیں آئی ہے۔ البتہ اگر ہم اس سے زیادہ عرصے کے بعد اس دیہی علاقے کو دیکھیں گے تو ہمیں اس میں بہت سی تبدیلیاں نظر آئیں گی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ آج سے بیس برس پہلے ایسا ہی ہو گا جیسا وہ آج ہے، لیکن اس عرصے سے پہلے وہ یقیناً ایک مختلف علاقہ رہا ہو گا۔ ماہرین جنگلات کے مطابق یہ عمل اس لئے ہوتا ہے کہ پیڑ پودے اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرتے ہیں۔ ہر پودے کی کوشش ہوتی ہے کہ وہی زندہ رہے۔ اپنی زندگی بچانے اور اپنی نسل کو پھیلانے کے لئے ہر پیڑ پودا بیج پیدا کر کے زیادہ سے زیادہ علاقے میں پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔

ہرا بھرا جنگل
بنجر زمین میں تبدیل
ہوتے ہوئے

اس علاقے میں زمینی علاقہ بھی شامل ہے اور پانی والا علاقہ بھی۔ نئے پودوں کو جب اور جہاں بھی موقع ملتا ہے وہ زمین کی سطح پر ابھر آتے ہیں۔ تاہم نئے پودوں کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اگر اس جدوجہد میں وہ کامیاب ہوجاتے ہیں تو پھر پہلے سے موجود پودے یقینی طور پر ہلاک ہوجاتے ہیں۔ پھر اسی طرح ایک دن یہ نئے پودے بھی پرانے ہوجاتے ہیں اور کچھ نئے پودے پیدا ہوکر ان کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور انہیں ہرا کر ہر طرف پھیل جاتے ہیں۔ ان علاقوں میں پودوں میں جنگ اس وقت تک جاری رہتی جب تک وہاں مضبوط پیڑ نہ اُگ آئیں۔ مضبوط پیڑوں کے اُگ آنے کے بعد پودوں کی یہ باہمی جنگ ختم ہوجاتی ہے۔ اور یوں یہ خطے مسلسل تبدیلی کی زد سے بچ جاتے ہیں۔ البتہ پھر جب کبھی وہاں غیر معمولی حالات پیدا ہوتے ہیں تو پھر یہی عمل شروع ہوجاتا ہے۔

پیڑ، پودوں کی مضبوط ترین شکل ہیں پیڑوں کو ان کی جگہ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ یہ عین ممکن ہے کہ جہاں پیڑ یا درخت اُگیں وہ جگہ کبھی جھیل رہی ہو۔

کئی سو برسوں کے عمل کے بعد ایک جھیل جنگل میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس عمل کی بالکل ابتداء میں چھوٹے چھوٹے پودے جھیل کی سطح میں پیدا ہونا شروع ہوتے ہیں۔ یہ پودے جھیل کی سطح میں زیادہ مٹی اور گارا جمع کر کے ہلاک ہوجاتے ہیں۔ مگر اس دوران جھیل کی زمینی سطح پہلے سے زیادہ بلند ہوجاتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ سطح اتنی بلند ہوجاتی ہے کہ وہاں کنول کے پھول کے پودے اُگ آتے ہیں، جو جھیل کی مٹی میں اپنی جڑیں پھیلاتے ہیں۔ کنول کے یہ پودے جھیل کی زمینی سطح کو اور بھی بلند کر دیتے ہیں اور پھر جھیل رفتہ

رفتہ ایک دلدلی تالاب میں بدل جاتی ہے۔ اس دلدلی تالاب میں سرکنڈوں اور ان کی نسل کے اور بہت سے پودے اگ آتے ہیں جو اس تالاب میں مزید مٹی جمع کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اور پھر جھیل ایک بھیگی ہوئی زمین میں بدل جاتی ہے۔ اور پھر وہاں عام پودے اُگ آتے ہیں۔ پھر وہاں جھاڑیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس مرحلے کے بعد پیڑ یا درخت نکل آتے ہیں۔ اور یوں وہاں کی زمین سخت سے سخت تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ درخت بہت سے چھوٹے پودوں کی روشنی بند کر کے انہیں ہلاک کر دیتے ہیں۔

یوں اس جگہ جہاں کبھی ایک جھیل تھی ایک جنگل اگ آتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس عمل کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اس عمل کے مشاہدے کے لئے آپ کو جھیل کے اطراف میں نگاہ ڈالنی چاہئے۔ کیوں کہ وہاں آپ کو بہت سے پیڑ پودے نظر آئیں گے۔ جھیل کے یہ کنارے رفتہ رفتہ اتنے پھیلتے ہیں کہ جھیل ختم ہو جاتی ہے۔

بہت سے پتھریلے علاقے بھی جنگلات میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ ان علاقوں میں ابتداء میں کچھ پودے نمودار ہو کر پتھروں سے چمٹ جاتے ہیں اور دھیرے دھیرے مٹی پیدا کرنے لگتے ہیں۔ مٹی پیدا کرنے کے لئے یہ پودے وہاں پر پہلے سے موجود گلے سڑے پودوں کے بچے کھچے حصوں اور چھوٹے چھوٹے پتھروں کو کام میں لاتے ہیں۔ اس کے بعد ان علاقوں میں مزید بڑے پودے نمودار ہوتے ہیں اور بالاخر وہاں بڑے بڑے پیڑ پیدا ہونے لگتے ہیں۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کسی خاص علاقے میں پودوں کی تبدیلی کے نتیجہ میں جنگل ایک خاص حصہ تک ہی کیوں محدود رہتا ہے، وہ دوسری جگہوں تک کیوں نہیں پھیلتا؟ اس کی مختلف وجوہات ہیں۔ مثال کے طور پر دنیا کے کچھ حصوں میں سخت سردی پڑتی ہے۔ اسی طرح بہت سے حصوں میں اتنی کم بارش ہوتی ہے کہ وہاں، پیڑوں کا اُگنا ناممکن ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی پیڑوں میں خاص قسم کی بیماریاں پھیل جاتی ہیں جس کے نتیجے میں پیڑ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں ہالینڈ میں ایک ایسی ہی بیماری پھیل گئی تھی جس کے باعث کئی جگہوں پر دیکھتے ہی دیکھتے درخت بالکل غائب ہو گئے تھے۔

زمین کے اوپر حیوانات کے اثرات بھی فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ مثلاً خرگوش وغیرہ پودوں کو جڑ سے اکھاڑ کر کھا جاتے ہیں اور یوں ان پودوں کو دوبارہ نشو و نما پانے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔

تاہم زمین کو جو حیوان سب سے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے وہ انسان ہے۔ ہم انسان لکڑی یا کاشت کی غرض سے درختوں کو کاٹ دیتے ہیں۔ بہت سی جگہوں پر انسان نے صدیوں کے عمل کے بعد وجود میں آنے والے درختوں کو اپنی ضروریات کے لئے نیست و نابود کر دیا ہے۔ اس عمل کی ابتدا میں انسان پہلے تو درخت کاٹتا ہے اور پھر درختوں سے محروم زمین پر جانوروں کو چرنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ یہ جانور پودوں کو اس طرح کھاتے ہیں کہ وہ جڑوں سمیت زمین سے اکھڑ جاتے ہیں اور پھر دوبارہ نمودار نہیں

جھیل کے سوکھ کر جنگل میں تبدیل ہونے کے پانچ مراحل

ہوتے۔ اس کے نتیجہ میں وہ زمین جو کبھی پودوں کی جڑوں کے باعث جمی ہوئی تھی اُکھڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ اور پھر بارش ہوتی ہے اور بارش کا پانی اس مٹی کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ یوں وہاں، جہاں کبھی جنگل تھا صرف پتھر رہ جاتے ہیں۔ دنیا کے بہت سے خطوں کے کسانوں نے اس عمل کو سمجھ لیا ہے چنانچہ وہ ایسی زمینوں پر اپنے جانوروں کو چرنے کے لئے نہیں چھوڑتے۔

ہمارا پیارا ملک پاکستان آج اس صورتحال کا شکار ہے۔ ہمارے یہاں پہلے ہی بہت کم جنگلات پائے جاتے ہیں۔ اور جو پائے جاتے ہیں ہم انہیں بھی تیزی کے ساتھ کاٹ رہے ہیں۔ ماہرین کے مطابق کسی بھی ملک کی متوازن معاشی ترقی اور خوشگوار ماحول کے لئے ضروری ہے کہ اس کے کل رقبہ کے ۱۵ فیصد پر جنگلات موجود ہوں۔ آپ کو معلوم ہے ہمارے پاکستان میں کل رقبے کے کتنے فیصد پر جنگلات پائے جاتے ہیں۔ ؟ جناب صرف ۵ فیصد پر۔ یہ ایک انتہائی تشویش ناک صورتحال ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی زندگی میں کم از کم ایک درخت ضرور لگائے۔ ذرا سوچئے اگر ہم میں سے ہر ایک یہ کام کرے تو ایک دن کے اندر پورے پاکستان میں کروڑوں درختوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ اتنے سارے درختوں کی موجودگی سے نہ صرف یہ کہ پورے ملک کی معاشی اور ماحولیاتی صورت حال بہتر ہوگی، بلکہ ہمیں ثواب بھی ملے گا۔ آپ کو معلوم ہے نا کہ درخت لگانا ایک ثواب کا کام ہے۔ تو پھر آپ آج ہی ایک پودا لگا رہے ہیں نا؟

(نوٹ:۔ اگلے ماہ ہم آپ کو حیوانات کی دنیا کی سیر کرائیں گے)

دلدل

قسط نمبر ۴

حمید کاشمیری

راشد کا باپ رمضان ڈرائیور ہیروئن پینے کا عادی تھا۔ راشد کو بھی ویڈیو گیم کی لت پڑ گئی تھی۔ وہ گھنٹوں گھر سے غائب رہتا۔ اس کی ماں ان دونوں باپ بیٹوں کی حرکتوں کی وجہ سے پریشان رہتی۔ ایک روز جب راشد حسب معمول ویڈیو گیم کھیلنے میں مشغول تھا، اس کی ماں روتی پیٹتی وہاں آئی اور یہ روح فرسا خبر سنائی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد راشد کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ اس نے تمام بُری عادتوں سے توبہ کر لی۔ تعلیم حاصل کرنا تو اس کے لئے ممکن نہ تھا، البتہ گھر کا خرچ چلانے کے لئے اس نے اپنے والد کے دوست رحمت مستری کی ورکشاپ پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ان دنوں شہر کے حالات کچھ ٹھیک نہیں تھے۔ آئے دن کے ہنگاموں اور کرفیو کی وجہ سے زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ راشد کا گھر تو بفرزون کے علاقے میں تھا اور ورکشاپ میوہ شاہ قبرستان کے قریب۔ ہر روز آنا جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کسی ممکنہ بُری خبر سے بچنے کے لئے رحمت مستری نے راشد کی والدہ سے بات کر کے راشد کو رات دن مستقل اپنے ورکشاپ پر رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ دن بھر تو خوشی خوشی کام کر لیا کرتا تھا۔ لیکن یہ پہلی رات کاٹنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ وہ اس آسیب زدہ ماحول میں ڈر رہا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا تھا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ خوف کی ایک لہر بار بار اس کے بدن میں جھرجھری پیدا کر دیتی۔ آخر کار وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس کے اٹھ بیٹھنے سے اس کے ساتھی بھی اٹھ بیٹھے اور یوں خوفزدہ ہونے پر اس کا مذاق اڑایا۔ لیکن راشد سچ مچ ڈر رہا تھا اس پر ان لوگوں کی تلقین کا کچھ اثر نہ ہوا اور جب وہ منہ لپیٹ کر سوگئے تو راشد تکیہ اور چادر بغل میں دبا کر ورکشاپ کی چھت پر چڑھ گیا...... کافی دیر اِدھر اُدھر کے خیالات اسے ستاتے رہے۔ پھر وہ نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا نجانے رات کا کونسا پہر تھا جب وہ ہڑابڑا کر اٹھا...... اس نے دیکھا کہ چند لوگ میت گاڑی میں سے اترے اور ایک میت کو اٹھا کر قبرستان کے اندر لے گئے جہاں انہوں نے اس کفن پوش کو ایک تازہ کھدی ہوئی قبر میں اتار دیا...... لیکن راشد نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ قبر میں اتاری جانے والی چیز لاش نہیں بلکہ لکڑی کی دو پٹیاں تھیں۔

صبح سویرے سب سے پہلے اکو کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا تو راشد کو نہ پا کر پریشان ہو گیا۔ اسلم اور گولا بھی جاگ گئے اور انہوں نے راشد کو چھت پر سوتا ہوا دیکھ لیا۔ ان کے جگانے پر راشد نیچے اترا اور رات کا سارا واقعہ انہیں سنایا۔ مگر کوئی بھی یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ تینوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ تھوڑی دیر بعد استاد بھی ورکشاپ پر آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب تھے۔ شاہ جی۔ یہ چاروں شاہ جی ہی کی کار کو ٹھیک کر رہے تھے۔ گولے نے استاد کو بھی راشد کے بارے میں بتایا اور استاد کے پوچھنے پر راشد نے ایک بار پھر رات والا واقعہ دہرایا۔ اسے سن کر استاد سے زیادہ شاہ جی چونکے لیکن بات ٹال گئے۔ گاڑی کی ٹرائی لینے کے لئے شاہ جی اپنے ساتھ راشد کو لے گئے اور راستے میں تمام حالات معلوم کئے۔ راشد نے انہیں سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ شاہ جی نے اسے اپنا بنگلہ دکھایا اور کسی بھی ضرورت کے وقت اپنی مدد کا یقین دلایا۔ راشد واپس آ کر اپنے کام میں مگن ہو گیا۔ رات کے وقت اسے کسی ضرورت سے قبرستان جانا پڑا تو واپسی میں عیسٰی گور کن سے ملاقات ہو گئی۔ عیسٰی گولے کا باپ تھا۔ اور اسے بھی راشد کی زبانی رات والے قصّے کا علم ہو چکا تھا۔ وہ اسے ایک تازہ کھدی ہوئی قبر کے پاس لے گیا اور اسے زبردستی قبر میں گرا کر اس پر مٹی ڈالنے لگا۔ باوجود کوشش کے خوف کی وجہ سے راشد کی آواز نہ نکل سکی۔

راشد قبر میں بے حس و حرکت چت لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ اور جسم خود بخود ساکت اور بے حرکت ہو گیا تھا اس نے کئی بار ہلنے جلنے کی اور شور کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود جیسے سچ مچ کا مردہ ہو۔

"شاباش ایسے ہی لیٹے رہو ہلنا نہیں"۔ عیسٰی گورکن نے اسے آہستہ سے پکار کر کہا اور پھر قبر کے آس پاس جمع کئے ہوئے مٹی کے ڈھیر میں پھاوڑا چلا کر آہستہ آہستہ مٹی راشد کے پاؤں کی طرف ڈالنے لگا۔ راشد دم بخود سب کچھ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا لیکن خوف نے اس کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی ساکت کر دی تھی پھر پتہ نہیں کہاں سے اور کیسے اس کے جسم میں ایک انجانی سی طاقت پیدا ہوئی اس نے پورا زور لگا کے اپنے بازو جو پھیلائے تو اس کا ایک بازو تو قبر کی دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور دوسرا ہاتھ دائیں جانب والی دیوار کے ایک گڑھے کے اندر چلا گیا اور اس نے محسوس کیا کہ جیسے ایک انسانی کھوپڑی اس کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ یہ غالباً برابر والی قبر کا گڑھا تھا جس میں مردے کی صرف ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں راشد نے سینے کے پورے زور سے ایک چیخ ماری لیکن چیخ پھر اس کے حلق سے باہر نہیں نکلی اس وقت راشد نے سو فیصد یقین کر لیا کہ وہ قبر میں زندہ گاڑا جا رہا ہے۔ اور یہ وقت جو گزر رہا ہے اس کی زندگی کا آخری وقت اور آخری شام ہے اور تھوڑی دیر بعد منوں مٹی کے نیچے دب کر اس کا دَم

گھٹ جائے گا اور یہ کہ وہ اکیلا نہیں مرے گا اس کی ماں جس کی زندگی کا وہ واحد سہارا ہے وہ بھی مر جائے گی اور اس کی ٹی بی کے مرض میں مبتلا بہن، جس کے علاج کے لئے وہ محنت کر رہا ہے وہ بھی بغیر علاج کے مر جائے گی۔ اس بات میں اب اسے کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ گولے کا باپ عیسیٰ صرف ایک گور کن نہیں کوئی خطرناک قسم کا مجرم بھی ہے جو اسے اس وقت قبر میں زندہ دفن کر رہا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ عیسیٰ نے پہلے بھی ایسا کیا ہوگا یا وہ پہلی مرتبہ ایسا کر رہا ہے لیکن پھر سوچنے لگا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ صبح اس کے اوپر مٹی کا ڈھیر ہوگا اور دیکھنے والے اسے ایک نئی قبر سمجھیں گے۔ ایک بچے کی قبر۔ اس کا باپ مرا تھا تو وہ جنازے کے ساتھ قبرستان میں آیا تھا اور اس نے ایک چھوٹی سی قبر پر کتبہ لگا دیکھا تھا جس پر یہ مصرع لکھا تھا کہ ۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اور اس نے اپنی ماں سے اس کا مطلب جب پوچھا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ یہ شعر بچوں کی یا نوجوانوں کی قبر پر لکھا جاتا ہے جنہوں نے دنیا میں ابھی بہت کچھ کرنا ہوتا ہے اور بہت کچھ دیکھنا ہوتا ہے لیکن وقت سے پہلے مر جاتے ہیں اور وہ سوچنے لگا تھا کہ کیا اس کی قبر پر بھی یہی لکھا جائے گا کہ ۔ حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ یہ کیسے ممکن ہوگا۔ کسی کو پتہ ہی کیسے چلے گا کہ وہ اس قبر کے اندر زندہ دفن ہوگیا ہے۔ راشد اندر ہی اندر خوف سے ایک بار پھر کانپ گیا۔

"یا خدا میری مدد کر ...." اس کے دل سے بے اختیار دعا نکلی۔ اور جیسے خدا نے فوراً اس کی دعا سن لی۔ اس نے محسوس کیا کہ قبرستان میں جیسے کوئی اور بھی ہے۔ جیسے کوئی اس کی قبر کی طرف آرہا ہے اور پکار رہا ہے۔ یہ ایک معصوم سی بچی کی آواز تھی۔ اور یہ بچی عیسیٰ گور کن کی آٹھ نو سالہ بیٹی نوشی تھی جو دور سے قبروں کو پھلانگتی ہوئی اپنے باپ کو پکارتی چلی آرہی تھی۔

"بابا............ او بابا............ بابا گھر آجاؤ جلدی" وہ پکارتی ہوئی قریب آتی جارہی تھی۔

"رک جا نوشی اُدھر ہی رک جا............" عیسیٰ چلّایا "کیا مصیبت پڑ گئی ہے تجھے اس وقت۔" لیکن نوشی رکی نہیں وہ بابا کو پکارتے پکارتے قریب آگئی عیسیٰ نے خوفزدہ ہو کر فوراً اپنا پھاوڑے والا ہاتھ روکا۔ اور ڈانٹ کر کہنے لگا "بس سن لیا جا دفع ہو جا یہاں سے۔"

"بابا وہ دو آدمی آن کے گھر بیٹھ گئے ہیں اور بہت دیر سے انتظار کر رہے ہیں" وہ بولتے بولتے اور قریب آگئی اور کہنے لگی۔ "کہتے ہیں بابا کو ڈھونڈ لاؤ جلدی سے۔ شاید ان کی میت آرہی ہے رات کو............ ابھی قبر چاہئے انہیں اور کہہ رہے تھے ...."

وہ ابھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اس کی نگاہ اچانک قبر کے اندر پڑی جہاں راشد چت سہا ڈرا لیٹا تھا اور

عیسیٰ اس پر مٹی ڈال رہا تھا

"بابا............ آہ" نوشی نے اتنی زور کی چیخ ماری کہ چیخ سارے قبرستان میں گونج گئی اور راشد کے جسم میں بھی جنبش پیدا ہوگئی۔

"کیا ہوگیا تجھے پاگل ہوگئی ہے؟" عیسیٰ نے نوشی کو ڈانٹ پلائی۔

"بابا یہ تو زندہ ہے۔" وہ سہم کر بولی۔

"تو میں کب کہہ رہا ہوں مرگیا ہے۔" عیسیٰ نے جواب دیا۔

"پھر اس پر مٹی کیوں ڈال رہے ہو؟" وہ حیران ہوکر بولی "تم تو دفن کررہے ہو اسے۔"

"تیری بھی کھوپڑی پھر گئی ہے" وہ ہنس کر بولا "ارے باؤلی یہ بچے کی قبر بنائی ہے میں نے۔ راشد کو لٹا کے اس کا ناپ دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی سی بڑی ہوگئی ہے۔ اس کو تنگ کرنا پڑے گا۔" وہ بات بناتے ہوئے بولا اور پھر راشد سے مخاطب ہوکر کہنے لگا "چل بھئی ٹھیک ہے نکل آ باہر"۔ اس نے راشد کی جانب قبر میں ہاتھ بڑھایا اور پھر نوشی سے کہنے لگا "تو جا گھر ان بندوں سے کہہ آرہا ہوں۔"

"یہ لڑکا مستری رحمت کے کارخانے میں کام کرتا ہے ناں؟" نوشی نے جاتے جاتے بڑی توجہ سے راشد کو دیکھتے اور پہنچانتے ہوئے پوچھا اور عیسیٰ نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں اپنا چھوکرا ہے۔ گولے کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اب تو جا میں بس قبر ذرا صحیح کرکے آرہا ہوں۔" نوشی عجیب نظروں سے راشد کو دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ عیسیٰ نے ہاتھ مزید لمبا کرکے سکتے میں مبتلا راشد کو قبر سے باہر نکالا اور بڑے معنی خیز انداز میں اسے کہنے لگا "یہ نہ سمجھنا تو نوشی کی وجہ سے بچ گیا ہے میں نے تجھے ویسے بھی آج نہیں مارنا تھا۔ صرف یہ بتانا تھا کہ یہاں اگر کام کرنا ہے تو اندھے بہرے اور گونگے بن کر کام کروگے۔ زیادہ بک بک کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ تمہیں زندے کو مٹی کھا جائے گی۔ اب جاؤ دفعہ ہوجاؤ۔" اس نے راشد کو قبروں کے بیچ سے نکلتے ہوئے راستے کی طرف دھکیل دیا۔ اور خوف کے مارے راشد نے ایک بار بھی مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ چپ چاپ پتھر کا بُت بنے قبروں کے بیچوں بیچ چلتا ہوا قبرستان کے اطراف پھیلی ہوئی لمبی ویران سڑک کے کنارے پہنچ گیا۔ اسے یہاں کھلی تازہ ہوا لگ رہی تھی اس نے محسوس کیا جیسے وہ دنیا میں نیا آیا ہے اور اسے ایک نئی زندگی ملی ہے۔

.... ○○ ....

آج رات اس کا سونے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ نہ اس کا جی چاہتا تھا کہ واپس کارخانے جائے۔ نہ اسے اکو اور گولے سے اس وقت ملنے کی خواہش تھی۔ "کیا وہ واپس ماں کے پاس چلا جائے؟" اس نے سوچا "لیکن نہیں"۔ اس نے خود ہی اپنے اس خیال کو مسترد کردیا۔ اس کی ماں بڑی مشکل سے کچھ سُکھ دیکھنے لگی ہے۔ وہ پھر دُکھی ہوجائے گی وہ ماں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا وہ اپنے دماغ کو سکون

دینے کے لئے اور ماحول سے تھوڑا سا فرار حاصل کرنے کے لئے چپ چاپ بے ارادہ خاموش تاریک اور سنسان سڑک پر قبرستان کے کنارے کنارے چلتے ہوئے کافی دور نکل گیا۔ معلوم نہیں کیوں اب اس کے دل میں کسی قسم کا خوف باقی نہیں رہا تھا۔ تقریباً آدھ پون گھنٹے تک چلتے چلتے وہ سرکنڈوں کے بنے ہوئے ایک چائے خانے کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ یہ چائے خانہ بہت ہی تنہا اور ویران جگہ پر تھا۔ گھاس پھوس کی چھت، سوکھی ٹہنیوں کی باڑ نما دیواریں، بیچ میں سرکنڈے لگے ہوئے۔ اندر پیٹرومکس گیس روشن تھا اور اِدھر اُدھر کونوں میں لالٹینیں جل رہی تھیں اندر لکڑی کی بوسیدہ میزیں اور بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ چائے پینے کے ارادے سے بھٹیار خانے کے اندر چلا گیا۔ اندر عجیب کیفیت تھی۔ مدہم مدہم روشنی میں دس پندرہ آدمی بیٹھے تھے لیکن سب تقریباً اونگھ رہے تھے یا ماحول سے بے خبر بیٹھے تھے۔ اس نے غور سے دیکھا تو اونگھنے والوں میں دو تین غیر ملکی، ہپّی جوڑے بھی تھے۔ جوان جوان گورے جوان جوان گوریاں میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس اپنے وجود سے بے خبر تھیں۔ ٹیبل والے نے راشد کو عجیب مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھی۔ وہ چائے پی ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ چائے خانے کے پیچھے بغیر کواڑ کے دروازے سے باہر پڑی جہاں نیم تاریکی میں ایک ادھیڑ عمر آدمی زمین پر بیٹھا کسی تکلیف کے عالم میں ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور ہاتھ اٹھا اٹھا کے اشاروں کے ساتھ راشد سے التجا کرتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ راشد سے چھوٹی عمر کا ایک بچہ ادھیڑ عمر آدمی کے پاس قدموں میں بیٹھا اس کی ٹانگیں دباتے ہوئے کچھ منت خوشامد کر رہا تھا لیکن ادھیڑ عمر آدمی بچّے کو بُری طرح دھتکار کر اور پرے دھکیل کر راشد سے التجا کرنے میں مصروف تھا جیسے بھکاری ہو اور اشارے سے کھانے کو کچھ مانگ رہا ہو۔ راشد نے چائے کے پیسے ٹیبل پر رکھے اور اٹھ کر باہر بوڑھے کے پاس آ گیا۔

"اے بیٹا خدا کے لئے میری مدد کر .... مجھے ایک دس روپے دے دے۔ میں دو دن سے بھوکا ہوں۔ زندگی بھر تیرا احسان نہیں بھولوں گا۔" وہ ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑاتے ہوتے راشد کے آگے التجا کرنے لگا۔ بالکل ایک پیشہ ور بھکاری کی طرح۔

"بابا گھر چلو۔ اماں بہت پریشان ہے۔ خدا کے واسطے بابا گھر چلو۔" راشد سے چھوٹی کے عمر کے بچّے نے اس آدمی کی منّت کرتے ہوئے کہا۔

لوہ دفعہ ہو جا، پرے ہٹ .... " بھکاری نما آدمی نے بچّے کو زور سے لات ماری "جہنم میں جائے تو بھی اور تیری اماں بھی۔" وہ بڑبڑایا اور پھر راشد کی جانب ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا "اے بیٹے اگر تو نے دس روپے نہ دیئے تو میں مر جاؤں گا۔"

"لو بابا........... " راشد نے جیب سے دس روپے کھٹ سے نکالے اور بوڑھے کو دے دیئے اسے آج ہی ہفتے کے پیسے ملے تھے۔ کچھ گاہکوں کی طرف سے بخشیش وغیرہ ملی ہوئی تھی سب مل ملا

کر نوّے روپے کے قریب اس کے پاس تھے وہ سوچ رہا تھا کہ استاد سے دس روپے اور لے گا اور کل چھٹی کے دن گھر جا کے پورے سو روپے اماں کی ہتھیلی پر رکھ دے گا تا کہ اکٹھی رقم ماں کے کسی کام آ جائے۔ لیکن اس بوڑھے کی کیفیت اس سے دیکھی نہ گئی۔ اسے اپنا باپ یاد آ گیا بالکل یہی کیفیت اس کے باپ کی ہو جایا کرتی تھی جب اسے پیسوں کی اور نشے کی طلب ہوتی تھی اور اس ادھیڑ عمر آدمی کو دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بھی نشے کی اسی بیماری میں مبتلا ہے جس میں اس کا باپ مبتلا تھا۔

ادھیڑ عمر آدمی کو جونہی دس کا نوٹ ملا وہ نوٹ دبوچ کر ایک سیکنڈ بھی وہاں نہیں رکا اور ہوا کی طرح بھٹیار خانے سے نکل کر سڑک کراس کرتا ہوا دور مدہم سی روشنی میں نظر آنے والے سگریٹ پان کے کھوکھے کی طرف دوڑ پڑا اور بچہ ہچکیوں اور سسکیوں سے رونے لگا۔

"مت رو۔ بس بس۔" راشد نے اسے دلاسہ دیا۔ بچہ ہمک ہمک کر منہ اٹھا کے راشد کو دیکھنے لگا اور شکایت کے لہجے میں بولا

"تم نے کیوں اس کو پیسے دیئے ....؟"

"نشہ کرے گا کیا؟" راشد نے پوچھا۔ بچّے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہیروئن پیتا ہے؟ ...." راشد نے دوبارہ پوچھا۔ بچّے نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"باپ ہے تمہارا؟ ...." راشد اپنے تجربے کی روشنی میں بولا۔

"ہوں" بچّے نے آنسو پونچھتے ہوئے سر ہلایا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟ ...." راشد نے پوچھا

"امجد ...." بچہ سسکیاں دباتے ہوئے بولا۔

"پڑھتے ہو امجد؟" راشد نے ہمدردی سے پوچھا۔

"پڑھتا تھا ...." امجد حسرت سے بولا "اب نہیں پڑھتا ہوں۔"

"اف میرے خدایا..........." راشد اندر ہی اندر خوف کھا گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس کی اپنی کہانی دہرائی جا رہی ہو۔ جیسے یہ بچّہ امجد نہیں راشد ہو۔ اور اس کے باپ کا نام بھی جیسے رمضان ہو۔ یا خدایا کتنے رمضان ہوں گے جن کے بچّے راشد اور امجد کی طرح ان کی زندگی میں یتیم ہو جاتے ہوں گے۔ یہ لوگ نشہ کیوں کرتے ہیں اور لوگ نشہ کیوں بیچتے ہیں۔ کیا ان منشیات فروشوں کو رحم نہیں آتا؟ کیا ان کی اپنی بیویاں اپنی مائیں اور اپنے بچے نہیں ہوتے؟ راشد اسی قسم کی باتیں سوچ رہا تھا کہ امجد کا باپ سامنے کھوکھے کی طرف سے واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔ جس کے وہ اطمینان سے کش لگا رہا تھا۔ پھر وہ واپس چائے خانے کی عقبی سمت اسی جگہ آیا جہاں راشد اور امجد بیٹھے تھے۔ بوڑھے نے سر کنڈوں کے ساتھ ٹیک لگائی اور آنکھیں موند کے بڑے سکون کے ساتھ سو گیا۔

"بابا.........." اس کے بیٹے نے پھر اسے آہستہ سے پکارا۔

"اب مجھے نہیں چھیڑنا.........." بوڑھے نے بھی دھیرے سے جواب دیا اور آنکھیں کھول کر قدرے نرم لہجے میں کہنے لگا،" جا گھر تھوڑی دیر میں میں بھی آجاؤں گا۔" اس کی اس بات پر امجد چپ چاپ اٹھا اور دھیرے دھیرے سامنے ایک کچی بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ راشد بہت اداس ہو گیا تھا۔ وہ بہت ہمدردانہ انداز میں امجد کو جاتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے نشے میں دُھت پڑے امجد کے باپ کو ترس کھانے کے انداز میں دیکھا اور چائے خانے کے عقبی دروازے کا چکر کاٹ کے پھر لمبی اور تاریک سڑک پر آگیا اور دھیرے دھیرے واپس اپنے ورکشاپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں اسلم اکو اور گولا اس کے منتظر تھے کیوں کہ آج اس نے خلاف معمول بہت دیر کر دی تھی۔ جس سڑک پر وہ چل رہا تھا۔ وہ طویل قبرستان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اور بہت اداس ویران اور تاریک تھی۔ لیکن راشد کے دل میں اب کسی قسم کا خوف نہیں رہا تھا وہ گورکن عیسٰی کے ڈر سے بھی بے نیاز ہو گیا تھا اس کے ذہن میں اب وہ لوگ تھے جو چائے خانے کے اندر اپنے اپنے گھروں اور بچوں کو چھوڑ کر نشے میں دھت پڑے تھے اور جو کسی دن اس کے باپ کی طرح ایڑیاں رگڑتے ہوئے مرجائیں گے۔ اور اس کے دماغ میں اس معصوم بچے امجد کی تصویر گھوم رہی تھی۔ جو اپنی معصوم کوشش کے باوجود اپنے باپ کو واپس گھر لے جانے میں ناکام تھا۔ اس کا باپ رمضان بھی اسی طرح گھر جانے سے انکار کر دیتا تھا اور گالی گلوچ کر کے راشد کو بھگا دیتا تھا۔ راشد انہیں خیلات میں کھویا سوچتا جارہا تھا کہ اچانک ایک کار اس کے قریب آکر رکی اور رکتے ہی کار کی بتیاں تھوڑی دیر کے لئے بجھ گئیں۔

"بیٹھو.........." کار کے اندر سے آواز آئی اور ساتھ ہی اگلا دروازہ کھلا۔ اگلا دروازہ کھلنے پر کار کے اندر کی بتی روشن ہوئی اِس نے غور سے ڈرائیور کو دیکھا تو وہ شاہ جی تھے راشد بلا خوف کار میں بیٹھ گیا۔

"کیوں گئے تھے وہاں ...." شاہ جی نے اس کے بیٹھتے ہی سوال کیا اور راشد نے سب کچھ شاہ جی کو صاف صاف بتادیا۔ عیسٰی گورکن نے جو اسے زندہ گاڑنے کی کوشش کی تھی اس واقعہ سے لے کر بھٹیار خانے کے اندر کی کیفیت تک جو کچھ اس نے دیکھا سب کچھ شاہ جی کو بتادیا۔

"اب تم نے سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھ لیا ہے کہ یہاں کیا ہورہا ہے۔" شاہ جی نے راشد کی بات سننے کے بعد کہا۔

"جی سر۔ اور مجھے عیسٰی گورکن نے دھمکی دی ہے کہ ...."

"ضرور دی ہوگی ...." شاہ جی اس کی بات کاٹ کر بولے۔ "لیکن تم فکر نہ کرو تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

شاہ جی نے راشد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد شاہ جی کی گاڑی ایک کوارٹر کے سامنے کھڑی تھی انہوں نے ہارن دیا تو ایک بچی باہر آئی۔ راشد چونکا۔ یہ نوشی تھی۔ پھر نوشی کی نظر بھی اچانک راشد پر پڑی اس نے بھی ایک بار پھر راشد کو پہچان لیا۔

"عیسیٰ گور کن کی بیٹی ہو............" شاہ جی نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی پوچھا۔

"جی............" نوشی نے سر ہلایا۔

"باپ کو باہر بھیجو۔" شاہ جی تحکمانہ انداز میں بولے۔ نوشی کے اندر جانے سے پہلے ہی عیسیٰ گور کن خود ہی باہر نکل آیا۔

"فرمایئے۔" اس نے شاہ جی سے پوچھا۔

"پاس آؤ۔" شاہ جی نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کہا۔ گلی میں اور کار میں اندھیرا تھا۔ عیسیٰ کار کے قریب آیا تو ملگجی روشنی میں وہ پہلے شاہ جی کو اور پھر راشد کو دیکھ کر چونکا۔

"مجھے جانتے ہو............" شاہ جی نے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے پوچھا۔

آپ کو کون نہیں جانتا جی۔" عیسیٰ کارڈ دیکھے بغیر خوفزدہ ہو کے بولا۔

"تو پھر غور سے سن لو............" شاہ جی نے تنبیہ کرنے کے لہجے میں کہا۔ "اور غور سے دیکھ لو اس بچے کو۔" انہوں نے راشد کی جانب اشارہ کیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولے، "اگر اس کو کوئی نقصان پہنچا، ایک ہلکی سی خراش بھی اسے آئی تو یاد رکھو یہ تو قبر سے نکل آیا ہے تم نہیں نکلو گے۔" انہوں نے شیشے سے منہ باہر نکالا کر کہا۔ "اور یہ بھی سن لو تم تو صرف چار چھ فٹ گہرا گڑھا کھود سکتے ہو ناں۔ میرے ہاتھ نیچے پاتال تک چلے جاتے ہیں۔ میں بندے کو سات زمینوں سے نکال کر باہر لے آتا ہوں۔ اور یہ بات تم اپنی گینگ کو بتادینا جو تمہیں دو چار سو روپیہ میں استعمال کر رہی ہے۔ اور اپنے اس لیڈر سردار عمر آسمانی کو بھی بتا دینا" شاہ جی ایک ہی سانس میں بولتے چلے گئے اور عیسیٰ پسینے میں شرابور ہو گیا۔............" "تم لوگوں کے دن اب تھوڑے رہ گئے ہیں" شاہ جی نے ایک اور دھمکی دی۔

"سر جی مجھے کچھ پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں............" وہ گھبراہٹ میں بولا۔

"تمہیں سب کچھ پتہ ہے۔ اور وقت آنے پر تم سب کچھ بتادو گے۔" شاہ جی نے آخری بات کہی اور گاڑی کو ریورس کر کے واپس موڑا عیسیٰ گور کن دم بخود ڈرا سہما اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ اور ابھی کار بمشکل بیس فٹ آگے گئی ہوگی کہ کسی جانب سے تڑاخ تڑاخ اوپر نیچے دو فائر ہوئے۔ اور گولیاں عیسیٰ گور کن کی کنپٹیوں سے باہر ہو گئیں۔ راشد سہم گیا۔ شاہ جی ایمرجنسی میں بریک لگائی اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پلٹ کر دیکھا تو عیسیٰ خون میں لت پت زمین پر پڑا تھا۔

(باقی آئندہ)

عیدی حاصل کرنے والے ۵۱ خوش نصیب

کیلکولیٹر:-
۱۔خرم شاہین ، بحرین ۲۔ شہلا علی لاہور ۳۔شاہد بٹ، گجرات ۴۔ شازیہ فرحین ،کراچی ۵۔سعدیہ دوحہ قطر ۶۔ سلمیٰ کمال، جہلم ۷۔حفاظت علی خان کراچی ۸۔ نجم یعقوب ، کراچی ۹۔ زہرہ حسن، راولپنڈی ۱۰۔ناجیہ عثمانی ، کراچی۔

پارکر قلم:-
۱۔صوفیہ امان ، منڈی بہاؤالدین ۲۔ رخشندہ خالد، ریاض ،سعودی عرب

گھڑیاں:-
۱۔ ارم خان ، ملتان ۲۔ سعد احمد پائی ۳۔ راجہ فاروق ،صادق آباد ۴۔سعدیہ فاطمہ ،اسلام آباد ۵۔سروپ گل ،کراچی ۶۔ ثمینہ بی بی سانگڑھ ۷۔ نوید الرشید لاہور ۸۔تابندہ کاظمی ایبٹ آباد ۹۔ محمد ارشد منہاس ،کراچی ۱۰۔صائمہ لطیف ، کوہاٹ ۱۱۔ کاشف طاہر، الریاض سعودی عرب ۱۲۔ اقبال احمد، کراچی ۱۳۔ محمد الیاس فرید مغل فیصل آباد ۱۴۔نسیم ناز دوحہ قطر ۱۵۔مقبول احمد گل سمندری ۱۶۔ بابو سلطان ستو نگ۔

امپورٹڈ پنسلز:-
۱۔ محمد اکرم سیال، ضلع شیخوپورہ ۲۔ محمد احسان الرحمٰن ، ڈیرہ غازی خاں

جیومیٹری بکس:-
۱۔عاصم عنائت ،کراچی ۲۔ عظمت نواز اٹک ۳۔کلیم اللہ ، صادق آباد ۴۔ فتح خان ، صلالہ عمان ۵۔ شہزاد عابد بیگ ، جہلم

خوبصورت قلم
۱۔ضیاء الحق ،کراچی ۲۔ ناظمہ ،کراچی ۳۔ جواد رسول رندہ شاہ بلاول ۴۔ شاہد محمود، لاہور ۵۔محمد ذیشان حضرو ۶۔ کاشف محی الدین راولپنڈی۔

کوریئن بال پوائنٹس:-
۱ امیر عبد اللہ، میانوالی ۲۔ ماریہ بانو ، لاہور ۳۔خرم حسین ، سکھر ۴۔ عدیل ، کراچی ۵۔ سید نزاکت شاہ ،اکوڑہ خٹک ۶۔ فرین اختر، قطر ۷۔فرح علی شاہ، ڈیرہ اسماعیل خان ۸۔ محمد لطیف ، کنول ۹۔ ارشد عباسی ، کراچی ۱۰۔یعقوب شہزاد ، بہاولپور۔

آئیے!

بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سلگائیں

سگریٹ وہ غیر محسوس زہر ہے جو ہماری زندگی کو گھُن کی طرح چاٹ جاتا ہے اور بالآخر مُوذی امراض اور تکلیف دہ موت کے انجام سے دوچار کرتا ہے۔

سگریٹ نشہ ہے جو ہم سے ہماری فعال اور متحرک زندگی چھین کر ہمیں سُستی، کاہلی اور بے ہمتی کے روگ دیتا ہے۔

سگریٹ وہ لت ہے جو مضبوط ارادوں اور آہنی عزائم کے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

سگریٹ پینے والے کبھی شاہین صفت نہیں ہو سکتے سگریٹ کا دھواں نگلنے والے ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھیے ہمارے اطرف جب کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو اُس کا دھواں اُسی کی رگوں میں اندھیرے نہیں بھرتا بلکہ ہماری سانسوں میں شامل ہو کر ہماری رگ وپے میں بھی اُترتا ہے۔ **تو پھر —— ہم احتجاج کیوں نہ کریں** سگریٹ پینے والے اپنے بزرگوں کو کیوں نہ سمجھائیں کہ سگریٹ انہی کی نہیں ہماری بھی قاتل ہے۔ اچھے لہجے میں، شائستہ طریقے سے مہذب بچوں کی طرح... آیئے اپنے بڑوں کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں آنکھ مچولی کی "سگریٹ چھوڑ تحریک" میں شامل ہو کر اسے موثر بنائیے۔

وزارت صحت اسلام آباد کو بھی آپ سب خط لکھیئے کہ حکومت سگریٹ کے اشتہارات پر پابندی لگا دے۔ قومی صحت کو تباہ کرنے والے اشتہارات پر پابندی بھی ضروری ہے۔

سائنس انکوائری

ایاز محمود

● تتلی کا رنگ ہاتھ لگانے سے کیوں اُڑ جاتا ہے؟

(تنویر شہزاد، بہاولپور)

آپ نے مچھلی کے جسم پر موجود سفنے Scales تو ضرور دیکھے ہوں گے ـــــ جب مچھلی والا مچھلی کو صاف کر کے اس کا گوشت بناتا ہے تو ایک تیز چھری سے مچھلی کے جسم کو چھیلتا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں چھوٹے چھوٹے بے شمار سفنے کھال سے اُترتے جاتے ہیں۔

تتلی کے جسم پر باریک باریک سفوف جیسا مادّہ ہوتا ہے جو ہاتھ لگاتے ہی جھڑنے لگتا ہے۔ یہ دراصل تتلی کے سفنے ہیں۔ یہ اس قدر نازک ہیں کہ ہمارے چھوتے ہی پروں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ سفنے عموماً مختلف رنگوں اور خوبصورت ڈیزائنوں کی صورت میں تتلیوں کے پروں پر پائے جاتے ہیں۔

ایفل ٹاور کہاں ہے اسے کب اور کس نے بنایا؟

السلطان شمس الحق قذافی۔ بوریوالہ

● آج سے تقریباً ایک صدی پہلے ۱۸۸۹ء میں فرانس کے شہر پیرس میں ایفل ٹاور کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس کی تعمیر کا سہرا ایک نہایت قابل انجینئر الیگزینڈر ایفل کے سر ہے جس کے نام پر ٹاور کا نام رکھا گیا۔ یہ ایفل ٹاور کے علاوہ مشہور و معروف مجسّمۂ آزادی کا معمار بھی ہے۔ پیرس کے وسط میں استادہ ایفل ٹاور کی اونچائی ۴۰۰ میٹر ہے۔ سیاحوں کو اس سے خاصی رغبت ہے اور وہ دور دور سے اسے دیکھنے آتے ہیں۔

● سائنس انکوائری کے ذریعے ہمیں پانڈا کے اصلی وطن، حلیہ، شکل و شباہت، خوراک اور افزائش نسل کے متعلق تفصیل سے بتائیں۔

السلطان شمس الحق قذافی

بوریوالہ

پانڈا کا شمار ان جانوروں میں ہوتا ہے جن کی

نسل کو ناپید ہونے کا خطرہ ہے۔ اسی لئے یہ نہایت بیش قیمت، جانور ہے اور اس کو بچانے کے لئے عالمی سطح پر کوششیں جاری ہیں۔

پانڈا چین کے بعض علاقوں میں بہت محدود تعداد میں پایا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ سب ملا کر ایک ہزار سے کچھ ہی زیادہ ہوں گے۔

پانڈا دیکھنے میں ایک بڑے بھالو کی طرح لگتا ہے۔ سیاہ اور سفید رنگت والے اس جانور کا وزن تقریباً ڈھائی سو پاؤنڈ تک ہوتا ہے، یعنی ایک موٹے تازے پہلوان کے برابر۔ دم سے لے کر ناک تک اس کی لمبائی چھ فٹ تک ہوتی ہے۔

چین کے مخصوص پہاڑی خطوں میں پائے جانے والے بانس کے پودے پانڈا کی غذا ہیں۔ یہ اس کے علاوہ کوئی اور چیز مشکل ہی سے کھاتا ہے اور اپنی اس عادت کی وجہ سے غذا نہ ملنے پر فاقہ کشی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں ایک مطالعے کے دوران یہ بات سامنے آئی اور فاقہ کشی کے ہاتھوں مرنے والے ۱۳۸ جانوروں کی لاشیں ملیں۔

دنیا کے مختلف ممالک کے چڑیا گھروں میں ان جانوروں کی پرورش کی جا رہی ہے اور انہیں حتی المقدور قدرتی ماحول بھی فراہم کیا جا رہا ہے۔ لیکن ان سب کوششوں کے باوجود ان کی تعداد بڑھانے میں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ پانڈا دنیا بھر کے لوگوں، خاص طور پر بچوں کا دل پسند جانور ہے اور اس کو امن اور دوستی کی علامت کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

سوال۔ بلّی کی آنکھیں رات کو کیوں چمکتی ہیں؟

راشد علی اعوان ...... حیدر آباد

جواب۔ بلّی کے علاوہ اور بہت سے دوسرے جانور ہیں جن کی آنکھیں رات کو چمکتی ہیں۔ شکار کے شوقین تجربہ کار لوگ رات کو چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ہی بتا دیتے ہیں یہ کس جانور کی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف جانوروں کی آنکھیں مختلف رنگوں میں چمکتی ہیں اور اسی بات سے ان کی پہچان ہوتی ہے۔

اب آیئے اپنے سوال کی طرف۔ آپ نے موٹر کار سے گزرتے ہوئے اشتہاری سائن بورڈ لگے ہوئے دیکھے ہوں گے جو رات کے وقت موٹر کار کی بتی سے چمک جاتے ہیں۔ اسی طرح سڑکوں پر چمکنے والے نشانات لگائے جاتے ہیں تاکہ وہ رات میں آسانی سے پڑھے جائیں یہ سب فلوری مرکبات کا کمال ہے۔ ان کی خصوصیت ہے کہ جب ان پر روشنی پڑتی ہے تو یہ منور ہو جاتے ہیں۔ بلی اور دیگر جانوروں کی آنکھوں میں بھی یہی فلوری مرکب ہوتا ہے لہٰذا روشنی کی ہلکی سی لکیر ان کو روشن کر دیتی ہے۔ مطلق اندھیرے میں جہاں روشنی بالکل نہ ہو یہ عمل نہیں ہو سکتا۔

سوال۔ نظریہ اضافت کے مطابق روشنی کی رفتار سے سفر کرنے سے وقت پر کیا اثر ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے؟

ذیشان احمد زکریا..... لاہور

جواب۔ آپ کے سوال کا مختصر جواب حاضر

ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ روشنی کی رفتار ۱،۸۶،۲۸۲ میل فی سیکنڈ ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ حد رفتار ہے اور کوئی بھی مادی شے اپنی رفتار کو روشنی کی رفتار سے بڑھا نہیں سکتی۔

دنیا کے عظیم ترین سائنس دان البرٹ آئن اسٹائن نے اپنے ایک نظریہ کو ریاضی کے اصولوں کے تحت ثابت کیا جس کی رو سے اگر کوئی مادی شے روشنی کی رفتار حاصل کرلے تو حیرت انگیز خصوصیات کی حامل ہو جائے گی۔

سوال۔ چاند پر آباد کاری کا سلسلہ کب سے شروع ہو گا؟

صائمہ انصاری ...... لطیف آباد حیدر آباد

جواب۔ چاند جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ایک مردہ اور بے آباد ویرانہ ہے جہاں زندگی اپنی کسی شکل میں بھی موجود نہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ چاند پر ہوا ہے نہ پانی۔ اس کی چونکہ کوئی فضا بھی نہیں اس لئے اس پر ہر وقت شہاب ثاقب برستے رہتے ہیں جنہوں نے اس کی شکل کو داغ دار بنا دیا ہے۔ چاند زمین کے مقابلے میں چھوٹا ہے اور اس لحاظ سے اس کی کشش ثقل بھی زمین کے مقابلے میں ٦ گنا کم ہے۔

یہ وہ سب مسائل ہیں جن کی وجہ سے چاند پر آباد کاری ایک دشوار گزار مرحلہ ہے۔ خلا نورد جب چاند پر جاتے رہے تو اپنے ہمراہ تمام انتظامات کر کے گئے۔ چاند پر چونکہ فضائی دباؤ نہیں ہے لہٰذا خاص طور پر تیار کردہ پریشر سوٹ بھی پہنے گئے جو کہ ان حضرات کو نہ صرف دباؤ نہ ہونے کی کیفیت سے بچاتے تھے بلکہ ایک معتدل درجۂ حرارت بھی برقرار رکھتے تھے۔

چاند پر آباد کاری کے لئے ان سب مسائل پر بخوبی قابو پانا ہو گا۔ یہ بہت حد تک ممکن بھی ہے لیکن فی الحال یہ بہت مہنگا شوق ہے اور اسی لئے مستقبل قریب میں اس کے کوئی امکانات نہیں۔

سوال ۔ کسی دھات کی کثافت سے کیا مراد ہوتا ہے؟

ذیشان احمد زکریا...... لاہور

جواب۔ مثال کے طور پر روشنی کی رفتار سے سفر کرتی ہوئی ریل گاڑی کی کھڑکیاں اس میں سفر کرنے والے مسافروں کو شکل الف میں دیئے گئے دائرے کے مطابق نظر آئیں گی مگر پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے لوگ اسے شکل ب کے مطابق دیکھ سکیں گے۔ یہ ایک اضافی تبدیلی ہے لہٰذا طبیعات کی اس شاخ کو جو روشنی کی رفتار سے حرکت کرنے والی اشیاء کی خصوصیات کو بیان کرے اضافی سکونی میکانیات (Relative static mechanism) کہا جاتا ہے۔

سوال، مقناطیس لوہے اور لوہے کی چیزوں کو اپنی طرف کیسے اور کیوں کھینچتا ہے؟

عمران خان...... پشاور

جواب، آپ نے اچھا سوال کیا ہے لیکن اس کا مکمل اور واضح جواب تھوڑا سا پیچیدہ ہے۔ ہم مختصراً بتائے دیتے ہیں اُمید ہے کہ اس سے کچھ نہ کچھ تشفی ہو جائے گی۔

یہ تو آپ نے ٹھیک کہا کہ مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے لیکن بھائی یہ صرف لوہے ہی کو نہیں کھینچتا بلکہ نکل اور کوبالٹ پر بھی اپنی اثر انگیزی دکھاتا ہے۔

یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ دنیا کی تمام اشیاء آئٹم یا جوہروں سے مل کر بنی ہیں۔ مقناطیس کے اندر بھی یہ صورتحال ہے کہ برقیے (Electr-ons)ایک مخصوص انداز سے مرکزے کے گرد چکر لگا رہے ہیں اور خود اپنے محور پر گھوم رہے ہیں۔ اس تمام عمل کے نتیجے میں مقناطیسی قوت پیدا ہوتی ہے جو ایک قسم کی برقی قوت ہے۔ لکڑی، کاغذ اور شیشے وغیرہ میں برقیوں کی گردش سے جو مقناطیسی میدان بنتا ہے وہ مختلف ہوتا ہے لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مقناطیس ان اشیاء کے ساتھ نہیں چپکتا۔ چند مخصوص دھاتوں کا مقناطیسی میدان کچھ اس طرح ترتیب شدہ ہوتا ہے جو مقناطیس کے اپنے میدان کے ساتھ یوں موافق آجاتا ہے کہ ہم ان کے مابین کشش کو واضح طور پر محسوس نہیں کرتے۔

سوال:۔ سونا (Gold)ایک قیمتی دھات ہے۔ اس کے کیمیائی اجزاء کون کون سے ہیں اور ان کا تناسب کیا ہے۔ یعنی کس تناسب سے ان اجزاء کو اکھٹے کریں تو سونا بن جاتا ہے۔

کاشف عمران...... گوجرانوالہ

جواب: کاشف صاحب! ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارے جواب کا بہت بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔ ایک زمانے میں بہت سے لوگ اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں سرگرداں رہتے تھے یہاں تک کہ ان کی عمریں اسی جستجو میں بیت جاتیں کہ لوہے یا کسی اور دھات کو سونا کیسے بنایا جائے۔ یہ حضرات اس زمانے کے مروجہ سائنسی علوم سے واقفیت رکھتے تھے اور انہیں کیمیاگر کہا جاتا تھا۔

بات دراصل یہ ہے کہ سونا ایک عنصر ہے۔ یعنی مادے کی سادہ ترین حالت۔ اسے دیگر عناصر اور مرکبات کی آمیزش سے نہیں بنایا جاسکتا۔ ہاں ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ دوسرے عنصر کے جوہر (Atom)تک رسائی حاصل کی جائے اور اس کے مرکزے (nucleus)کو اس طرح توڑا جائے کہ وہ ٹوٹ کر سونے کا جوہر بنا لے۔

یہ بات اگر آپ کو مشکل لگی ہو تو ہم ایک مثال سے آپ کو سمجھاتے ہیں۔ نائیٹروجن ایک عنصر ہے۔ اس کے جوہر پر یلغار بول کر مرکزے کو توڑا جاتا ہے تو ایک جوہر آکسیجن اور ایک جوہر ہائیڈروجن کا وجود میں آجاتا ہے۔ اسی طرح کی دوسرے عنصر مثلاً سیسے کے جوہر کو سونے کے جوہر میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

لیکن بھائی، ایسا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ جوہر کا مرکزہ نہایت ہی مضبوط ہوتا ہے اور اسے صرف جوہری طاقت ہی سے توڑا جاسکتا ہے۔ سونا بنانے کے لئے ایسا کرنا گھاٹے کا سودا ہے کیونکہ اس طرح سے حاصل شدہ سونا قدرتی حالت میں پائے جانے والے سونے سے بہت بہت زیادہ مہنگا پڑے گا۔

●

بے اصولی

شاہنواز فاروقی

گندم نہ باجرہ ہوں، گاجر ہوں میں نہ مُولی
پہچان جائیں مجھ کو، یہ میں ہوں "بے اصولی"

تعلیم ہو کہ مذہب ، بزنس ہو یا صحافت
ہر اک جگہ ہے قائم، پیارو مری حکومت

میں پھیلنے لگی ہوں ہر سُو اصول بن کر
کانٹا ہوں، پر جہاں میں، رہتی ہوں پھول بن کر

میرے اثر سے دیکھو، دنیا میں دن یہ آئے
سارے اصول جگ کے پھرتے ہیں منہ چھُپائے

رکھتے اصول سے ہیں جو لوگ رشتہ داری
وہ میری سلطنت میں مجرم ہیں اشتہاری

ہوتی ہے مجھ سے پیدا دنیا کی ہر برائی
شیطاں پکارتا ہے کہہ کرکے مجھ کو تائی

کیا میرا فلسفہ ہے؟ اُس کو نہ چاہے سمجھو
بارے میں میرے لیکن، اک بات یاد رکھّو

جس نے مجھے بھُلا کر دنیا میں داؤ کھیلا
وہ آدمی جہاں میں کہلائے گا کریلا

کون جیتا کون ہارا

سلمان نقی ۔ کراچی

★ ورلڈ کپ فٹبال ٹورنامنٹ سب سے پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں یوراگوئے کے مقام پر ہوا جس میں یوراگوئے نے ارجنٹائن کو تین کے مقابلے میں چار گول سے شکست دی تھی۔

★ ۱۸۶۳ء میں فٹبال ایسوسی ایشن قائم ہوئی جس نے فٹبال کے اصول وضوابط متعین کئے جو آج بھی کم و بیش دنیا بھر میں رائج ہیں۔

★ اٹلی نے ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۸ء میں دو بار لگاتار ورلڈ کپ جیتا۔ ۱۹۳۴ء میں اس نے چیکوسلواکیہ اور ۱۹۳۸ء میں ہنگری کو شکست دی تھی۔

★ برازیل کے "پیلے" نے دنیا کے تمام کھلاڑیوں سے زیادہ مرتبہ ورلڈ کپ جیتنے والی ٹیم کے ہمراہ شرکت کی۔ وہ ۵۸ء، ۶۲ء اور ۷۰ء کے ورلڈ کپ جیتنے والی برازیلین ٹیم میں شامل تھا۔

★ یوراگوئے نے ۱۹۵۰ء میں برازیل کو ہرا کر پہلی پوزیشن حاصل کی۔

★ ۱۹۵۴ء میں مغربی جرمنی نے ہنگری اور ۱۹۵۸ء میں برازیل نے سوئیڈن کو ہرا کر ورلڈ کپ فٹبال کا اعزاز حاصل کیا۔

★ ورلڈ کپ فٹبال میں حصہ لینے والا سب سے کم عمر کھلاڑی خوامن وہائٹ سائیڈ تھا جس نے ۱۷ جون ۱۹۸۲ء کو شمالی آئرلینڈ کی طرف سے یوگوسلاویہ کے خلاف ۱۷ سال ۴۲ دن کی عمر میں میچ کھیلا تھا۔

★ برازیل نے ۱۹۶۲ء میں چیکوسلواکیہ اور ۱۹۶۶ء میں برطانیہ نے مغربی جرمنی کو شکست دے کر ورلڈ فٹبال کپ کا اعزاز حاصل کیا۔

★ ۱۹۷۰ء میں برازیل نے اٹلی اور ۱۹۷۴ء میں مغربی جرمنی نے ہالینڈ کو ہرا کر ورلڈ کپ فٹبال کا اعزاز جیتا۔

★ ارجنٹائن نے ۱۹۷۸ء کو اٹلی اور ۱۹۸۲ء میں اٹلی نے مغربی جرمنی کو ہرا کر ورلڈ کپ کا اعزاز حاصل کیا۔

★ ورلڈ کپ فٹبال میں کیا جانے والا تیز ترین گول برطانیہ کے برائن رابسن نے ۱۶ جون ۱۹۸۴ء کو فرانس کے خلاف میچ شروع ہونے کے ۲۷ سیکنڈ بعد کیا تھا۔

★ ۱۹۸۶ء کے ورلڈ کپ کے فائنل میں ارجنٹائن نے مغربی جرمنی کو شکست دے کر ورلڈ کپ فٹبال ٹورنامنٹ کا اعزاز جیتا تھا۔

★ فٹبال میں بہترین دفاعی کھیل پیش کرنے والی ٹیم برطانیہ ہے جس کے خلاف ۱۹۶۶ء میں چھ میچوں کے دوران صرف تین گول ہوئے۔

ہوایوں کہ .....

"ہوایوں کہ" عام زندگی میں پیش آنے والے دلچسپ مگر مختصر واقعات کا مزاحیہ سلسلہ ہے ہمارے بیشتر ساتھی گھسے پٹے لطائف کو اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ کہہ کر ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ وہ ایسا کرنے سے گریز کریں، کیونکہ ایسے واقعات اگر شائع ہو بھی گئے تو پڑھنے والے انہیں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھیں گے۔ یوں آپ کی شخصیت قارئین پر اچھا اثر نہیں چھوڑے گی۔

ادارہ

ہوایوں کہ! ہم اپنے ماموں جان کے گھر گئے ہوئے تھے۔ ہم ان کے گھر کی گلی میں اپنے کزن اور اسکی چھوٹی بہن کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو ہمارے دوسرے ماموں باہر کھڑے تھے ہم نے انہیں کہا کہ اندر آجائیں لیکن انہوں نے کہا کہ اپنے ابو (یعنی میرے ماموں) کو یہیں بلالاؤ، میری کزن اندر جاکر اپنے ابو سے بولی کہ باہر کوئی آدمی آپ سے ملنے آیا ہے۔ میرے ماموں

نے کہا کہ پتہ نہیں کون شخص آیا ہے خیر باہر گئے اور بات کر کے واپس آئے تو میری کزن سے بولے کہ تمہیں یہ نہیں پتہ کہ وہ تمہارے چچا ہیں تو وہ پریشان سی ہو کر بولی "میں بھول گئی تھی ۔" اسکا یہ جواب سن کر ہم بہت ہنسے۔ اب بھی یہ بات ذہن میں آئے تو ہنسی آجاتی ہے۔

مرسلہ، حماد اکرم لاہور

"ایک دفعہ امی نے میرے چھوٹے بھائی کاشف کو مٹی کا تیل مٹی میں ڈالتے دیکھا تو پوچھا "بیٹا، یہ مٹی کا تیل مٹی میں کیوں ڈال رہے ہو۔ اس پر کاشف نے معصومیت سے جواب دیا "امی مٹی کا تیل ہے مٹی کو دے رہا ہوں" کاشف کا یہ جواب سن کر ہم سب بہن بھائیوں کو بے حد ہنسی آئی۔ اور میں یہ سوچنے لگی واقعی ایک طرح سے کاشف ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔

مرسلہ، سیدہ کاشفہ خاتون کراچی

ہوا یوں کہ ہمارے ایک دوست جنہیں لفٹ لینے کی عادت تھی فرماتے تھے کہ اس طرح بچت بھی ہو جاتی ہے اور کاروں میں بیٹھنے کی حسرت بھی پوری ہو جاتی ہے۔

ایک دن ہم بس اسٹاپ پر کھڑے ویگن کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں ناظم آباد جانا تھا۔ ہمارے دوست بضد تھے کہ بذریعہ لفٹ چلتے ہیں ہم نے کہا کہ بھئی ہم تو ویگن سے ہی جائیں گے تم بیشک لفٹ لیکر پہنچو۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے میں تو لفٹ لیکر ہی جاؤں گا اور ہم سے تھوڑا ہٹ کر آنے والی گاڑی کو انگوٹھا دکھایا۔ گاڑی قریب آکر رکی تو اس میں ایک لڑکی تھی اس نے پوچھا! "جی فرمایئے" ہمارے دوست نے کہا "ناظم آباد تک جانا ہے"۔ لڑکی نے جلدی سے ساتھ پڑا ہوا پرس اٹھایا ایک روپیہ نکال کر ہمارے دوست کی طرف بڑھایا اور کہنے لگیں "یہ لیں پیچھے ویگن آرہی ہے اس میں بیٹھ جائیں"۔ مت پوچھیں کہ اس وقت ہمارے دوست کی کیا حالت ہوئی ہمارا ہنس ہنس کر برا حال تھا۔ اور وہ بیچارہ ہمارا منہ تک رہے تھے وہ دن اور آج کا دن انہوں نے کبھی لفٹ کا نام ہی نہیں لیا۔

مرسلہ، شمشیر علی پشتون، کراچی

ہوا یوں کہ! میری چھوٹی بہن نبیلہ ایک دفعہ امی سے پوچھنے لگی "امی بیوہ کسے کہتے ہیں" امی جان نے جواب دیا "بیٹا! خدانخواستہ جس کا خاوند یا شوہر نہ ہوں اسے بیوہ کہتے ہیں" نبیلہ جلدی سے بولی، "ہا امی اسکا مطلب یہ ہے کہ میں اور باجی اور آپی تینوں بیوہ ہیں"۔ ہم اسکی معصومیت پر بڑے لطف اندوز ہوئے آج بھی جب اسکی اس انداز سے کہی ہوئی یہ بات یاد آتی ہے تو ہونٹوں پر ہنسی بکھیر جاتی ہے"

مرسلہ: شازیہ امجد لاہور

ہوا یوں کہ میں ایک دفعہ ضروری کام کی وجہ سے نزدیکی شہر جانے لگا۔ میرے ساتھ میرا دوست یعقوب بھی تھا۔ جاتے وقت اباجان نے مجھے کہا کہ واپسی پر یا جاتے ہوئے راستے میں واقع اڈہ پر میرے فلاں دوست کو یہ پیغام دیتے جانا اور ساتھ ہی میری کلائی پر دھاگہ باندھ دیا کہ بھول نہ جانا۔ لیکن ابوؔ پیغام دینے کی بجائے جلد ہی کسی اور کام میں مشغول ہو گئے اور ہمیں بھی یاد نہ رہا اور روانہ ہو گئے راستے میں یعقوب نے پوچھا کہ یہ کلائی پر دھاگہ کیسا؟ تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ یعقوب حیران ہوا اور پوچھا کیا وجہ ہے؟ تو میں نے اسے بتایا کہ ابو نے ایک پیغام اپنے دوست کو دینے کو کہا تھا اور دھاگہ اس لئے باندھا کہ بھول نہ جاؤں لیکن خود مجھے پیغام دینا بھول گئے ہیں۔ آج بھی یعقوب مجھے وہ واقعہ یاد دلا کر خوب ہنستا ہے۔

مرسلہ۔ غلام عباس طاہر، شور کوٹ

ایک گاؤں کے پرائمری اسکول میں ایک سپرنٹینڈنٹ آیا۔ اس نے چہارم جماعت کے ایک لڑکے کو اردو پڑھنے کو کہا۔ لڑکا پڑھنے لگا۔ ایک لفظ "چونکہ" کو وہ "چن کہ" پڑھ گیا۔ سپرنٹینڈنٹ نے کہا کہ یہ لفظ غلط ہے۔ تو سپرنٹینڈنٹ کے پیچھے کھڑے ہوئے کلاس انچارج نے کہا کہ سر میں نے اس کو کتنی مرتبہ کہا ہے کہ یہ "چُن کہ" نہیں "چونقہ" ہے۔

مرسلہ، محمد سلیم رحیم یار خان

ہوا یوں کہ ایک مرتبہ میرے چھوٹے بھائی کا جنرل نالج کا زبانی امتحان ہو رہا تھا اس سے سوال پوچھا گیا "وٹ از یور فادر یعنی تمہارا باپ کیا کام کرتا ہے میرے بھائی یاسر نے جواب دیا "سر مائی فادر از اے مین" یہ سن کر ہمیں بہت ہنسی آئی۔

ناصر محمد۔ ہنگو

ہوا یوں کہ میرے بھائی کو ابو انگریزی پڑھا رہے تھے۔ ابو نے اس سے کہا! سہیل اس جملے کو انگریزی میں ترجمہ کرو "وہ تاریخ یاد کر رہا ہے" میرے بھائی نے جملہ بنایا۔ He is learning date ابو یہ جملہ سن کر بہت ہنسے۔

مرسلہ لبنیٰ سعدیہ،

میرا چھوٹا بھائی شانی بہت شرارتیں کرتا ہے۔ ایک دن وہ کسی بات پر امی سے ناراض ہو گیا اور غصے میں چھت پر چلا گیا۔ میں اسے منانے گیا اور اسے بہلایا کہ تم تو بڑے ہو کر پائلٹ بنو گے اور پائلٹ کوئی روتے تھوڑی ہیں۔ وہ فوراً مان گیا اور کہنے لگا، "بھائی جان! جب میں پائلٹ بنوں گا اور جہاز چلاؤں گا تو سب سے پہلا بم اپنے گھر پر پھینکوں گا" میں نے نیچے آ کر امی اور سب گھر والوں کو یہ بات بتائی تو سب اس کی معصومیت پر ہنس پڑے۔

مرسلہ سلیم اختر لاہور

ہوا یوں کہ ایک دفعہ دوپہر کے وقت سب گھر والے سو رہے تھے مگر مجھے، میرے بھائی اسد اور کنول کو نیند نہیں آرہی تھی۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ چلو کوئی ڈرامہ کرتے ہیں۔ ڈرامے میں کنول اور اسد مجھے پکڑ کر لے جاتے ہیں اور باندھ دیتے ہیں اور جھوٹ موٹ مارتے ہیں۔ اس کے بعد اسد میری چھوٹی بہن سے جس کا ڈرامے میں فرضی نام شیدا ہوتا ہے کہتا ہے "چل شیدے اب تو ذرا اسے سبق سکھا میں ابھی آتا ہوں۔" یہ سن کر میری چھ سال کی معصوم بہن دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک قاعدہ تھا اس نے قاعدہ میرے سامنے رکھا اور کہا کہ چلو سبق پڑھو الف سے آم ب سے بکری۔ اس کی یہ معصومیت دیکھ کر میں بے اختیار ہنس پڑی۔

شازیہ غفار کراچی

ہوا یوں کہ جب میں بہت چھوٹی تھی تو ایک دفعہ ہم سب گھر والے ریل گاڑی میں کراچی جا رہے تھے۔ اے، سی کے ڈبے میں ہر کسی کو دو نوکر ملتے ہیں۔ ہمیں بھی ملے ہوئے تھے جن میں سے ایک گنجا تھا۔ دوپہر کے وقت سب آرام کرنے کی غرض سے لیٹے ہوئے تھے جب کہ میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ جب گاڑی سکھر کے اسٹیشن پر پہنچی تو ابوّ نے جو کھڑکی سے کافی دور بیٹھے ہوئے تھے مجھ سے پوچھا! بیٹا کونسا اسٹیشن ہے میں سمجھی ابوّ پوچھ رہے ہیں باہر کونسا نوکر گیا ہے۔ اتفاق سے گنجا والا نوکر اسی وقت ڈبے سے اترا تھا میں نے کہا "گنجا ہے" ابوّ نے دوبارہ پوچھا کونسا؟ میں نے جھٹ جواب دیا "گنجا۔" میری اس بات پر سب لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔

ارم حسن راولپنڈی

ایک دن ہم اپنی خالہ کے گھر گئے۔ ہمارے خالو کے گلے میں تکلیف تھی۔ انہوں نے ہماری خالہ سے کہا کہ گرم پانی دے دو میں غرارے کروں گا۔ میری خالہ زاد بہن جس کی عمر ۳ سال ہوگی اسے کپڑا پہنے کا بہت شوق ہے۔ اس نے جب غرارے کا سنا تو کہنے لگی "اللہ! ابو آپ غرارے میں کتنے اچھے لگیں گے" ہم یہ سن کر بے اختیار ہنس پڑے۔

مرسلہ معین الدین کراچی

ہوا یوں کہ ایک دن میں اپنے بھانجے کو اسکول میں داخل کرانے گئی تو میڈم نے اس سے گنتی سنانے کو کہا تو میرے بھانجے نے گنتی یوں سنائی ایک، پانچ دو، آٹھ، سات وغیرہ۔ پھر میڈیم نے کہا کہ کوئی گانا سناؤ۔ میرے بھانجے نے گانا گانا شروع کیا، ایک، دو، تین، چار پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ، بارہ، تیرہ، تیرا کروں، تیرا کروں ...... یہ سنکر ہم دونوں کو اتنی ہنسی آئی کہ مت پوچھیئے۔

مرسلہ صائمہ انصاری، حیدر آباد

زمین کی کہانی میری زبانی

ساجد سعید

انسان ہمیشہ اس جستجو اور کوشش میں لگا رہا ہے کہ یہ کائنات اور اس میں موجود چاند، سورج اور زمین جس میں ہم رہتے ہیں کس طرح وجود میں آئے؟ یہ سمندر یہ جنگل بیاباں اور یہ پھول اور پودے کیسے بنے، ان سب کی تخلیق کیسے ممکن ہوئی؟ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ہماری زمین کیسے وجود میں آئی۔البتہ ماہرین فلکیات اور ارضیات کے خیال کے مطابق اب سے ایک کھرب سال پہلے اس کائنات کا وجود تک نہ تھا۔ بس ایک روشنی تھی۔ یہ تو آپ کو پتہ ہے کہ روشنی توانائی کی ایک صورت ہے اور ہر مادی چیز کشش ثقل کے سبب دوسری مادی چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔یہی معاملہ ہائیڈروجن کے ذرّات کا تھا۔ ہائیڈروجن کا ہر ذرہ دوسرے ذرے کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔اسی کشمکش میں ہائیڈروجن کے ذرّات ایک مرکز میں جمع ہوتے گئے اور بالآخر ہماری کائنات نے ایک سرخ گولے کی شکل اختیار کرلی۔ وقت گزرتا گیا کائنات اپنی شکل بدلتی رہی اور پھر درجۂ حرارت کی زیادتی سے اس کا رنگ سفید ہوگیا۔جب درجہ حرارت حد سے بڑھ گیا تو ایک دھماکے کے ساتھ یہ گولہ پھٹ گیا اور اس کے پھٹ جانے کے بعد اس کے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے اور اس طرح ہزاروں کہکشائیں وجود میں آئیں،جن کے وسعت کا ہم اندازہ نہیں کرسکتے۔ یہ دھماکہ کروڑوں ''ایٹمی دھماکوں جیسا تھا۔ اس دھماکے کے نتیجے میں جو تابکار شعاعیں پیدا ہوئیں وہ آج بھی خلا میں آوارہ گردش کر رہی ہیں ان تابکاری شعاعوں کو کائناتی (Cosmic—Rays)شعاعیں کہا جاتا ہے۔ اس دھماکے کے نتیجے میں جو لاکھوں کہکشائیں وجود میں آئیں اُن میں اتنی کشش تھی کہ وہ اپنی سے چھوٹی کہکشاؤں کو اپنی کشش سے کھینچ کر دوبارہ کائنات میں تباہی لاسکتی تھیں،لیکن پھر کہکشاؤں نے گردش شروع کردی اور اس طرح ہماری کائنات دوبارہ ایک بڑی تباہی سے بچ گئی اور یہ گردشیں قیامت تک جاری رہیں گی۔

سورج بھی ہماری کائنات کا ایک ننھا منا سیارہ تھا۔ اس گیس کے گولے میں ۹۸ فیصد مقدار ہائیڈروجن اور ہیلیئم کی تھی۔ آج سے کروڑوں سال پہلے ایک بہت بڑا ستارہ سورج کے قریب سے گزرا اور سورج اس کی کشش میں آ گیا اور گیس کے اس گولے میں زبردست لہریں اٹھیں اور اس کے کئی ٹکڑے فضا میں ادھر ادھر بکھر گئے ان ٹکڑوں کے ارد گرد بہت سے ستارے تھے جو اپنی کشش سے ان ٹکڑوں کو اپنی طرف کھینچنے لگے اور بالآخر یہ ستارے خلا میں ہی لٹکے رہ گئے۔ جی ہاں ان آٹھ ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑہ ایسا بھی تھا جہاں آج سے کروڑوں سال پہلے جانداروں نے جنم لیا۔ پہلے یہ ٹکڑے لمبوتری شکل کے تھے۔ وقت کے ساتھ ان کی شکلیں بدلتی گئیں۔ اس وقت ان آٹھ سیاروں کے مدار موجودہ حالت کی طرح بیضوی اور مستقل نہیں تھے بلکہ بے قاعدہ اور غیر مستقل تھے۔ ان سیاروں میں ایک سیارہ زمین بھی تھا جہاں زندگی کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ ایک گرم گولہ تھی لیکن سورج سے دوری کے باعث یہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی پڑتی گئی۔ شروع میں ایٹمی طریقوں سے زمین کے مختلف عناصر سے کئی مختلف عناصر بنے اور پھر انہی عناصر کے کیمیائی عمل سے سینکڑوں مرکبات وجود میں آئے۔ ان مرکبات میں پانی بھی تھا جو ہائیڈروجن اور آکسیجن کے کیمیائی عمل سے وجود میں آیا۔ کروڑوں سال پہلے تک پانی بھاپ کی شکل میں فضا میں موجود رہا۔ لیکن جب زمین کا درجۂ حرارت سو سینٹی گریڈ سے نیچے گر گیا تو بادل سے پانی برسنے لگا۔ زمین پر ہر طرف کھولتا ہوا سمندر ٹھاٹیں مارنے لگا۔ زمین شروع میں بالکل ہموار تھی جب اس نے گیس سے مائع اور مائع سے ٹھوس شکل اختیار کی تو یہ سکڑ گئی جس کی وجہ سے اس میں دراڑیں پڑ گئیں اور اس میں مختلف نمایاں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ پھر اس میں خشکی نے جگہ لی۔

زمین ابتدا میں زندگی سے بالکل خالی تھی۔ تو آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے نظام شمسی کے بعض سیاروں میں بعض زہریلی گیسیں بہت زیادہ مقدار میں پائی جاتی ہیں جن میں امونیا اور میتھین بھی شامل ہیں۔ ان گیسوں سے بہت سے مرکبات بنے جن میں روغنیات اور نشاستے وغیرہ شامل تھے۔ کروڑوں سال پہلے زمین کی حالت موجودہ حالت سے مختلف تھی اس وقت کی دھوپ میں تابکاری اثرات تھے۔ ہوا اور درجۂ حرارت بھی موجودہ حالت سے مختلف تھا۔ پانی نے ان تبدیلیوں میں اہم کردار ادا کیا۔ آتش فشاں کے پھٹنے (جو اس وقت پورے کرہ ارض پر موجود تھا) سے بہت سے عناصر فاسفورس اور گندھک سمندر میں آ ملے۔ یہیں سے زندگی کی ابتدا ہوئی۔

زمین پر زندگی کی ابتدا ایسے جانداروں سے ہوئی جن کو نہ تو جانوروں میں شمار کیا جا سکتا تھا نہ بے جانوں میں۔ جی ہاں یہ تھے وائرس (Virus) جو پروٹین اور نیوکلیک کی پیداوار تھے اور یہیں سے زندگی کی ابتدا ہوئی۔ یہی وہ دور ہے جہاں سے جانداروں نے کرہ ارض پر جنم لیا اور اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھالنا

شروع کیا۔ اس وقت کے جاندار صرف ایک خلئے پر مشتمل تھے ۔ جب زمین میں بھاپ نے پانی کی شکل اختیار کی اور درجہ حرارت میں کمی آئی تو بہت سی انقلابی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں ۔ اس وقت حیوانات اور نباتات میں کوئی تمیز نہ تھی ۔ اسی ابتدائی دور میں ایک جراثیم نما جاندار پیدا ہوا جو کلوروفل کی ابتدائی صورت تھی ۔ اس نے اپنی خوراک خود تیار کرنا شروع کی ۔ ابتدائی دور کے جانداروں نے نہ صرف سورج کے ذریعے اپنی غذا حاصل کی بلکہ اُس کی توانائی کو بھی اپنے اندر جذب کرنا شروع کیا۔ شروع کے دور میں حیوانات کی غذا میں نباتات کے علاوہ دوسرے اقسام کے جانور بھی شامل تھے ۔

آج سے کوئی ساٹھ کروڑ سال پہلے سطح زمین پر پچانوے فیصد رقبے پر سمندر تھا جس کی سطح کبھی بلند ہو جاتی اور کبھی گر جاتی ۔ اس وقت کے ابتدائی جانداروں میں اسفنج، تارا مچھلی، بیکٹیریا اور ایلجی (Algae) وغیرہ شامل تھے جن میں گوشت پوست کے علاوہ کچھ نہ تھا ۔ یعنی اس وقت ہڈی والے جانور پس پردہ تھے اور زندگی سمندر تک محدود تھی ۔ اب سے پچاس کروڑ سال پہلے زمین پر آکٹوپس (Octopus) دوشاخہ مچھلی اور گھونگھے جیسے جانور پیدا ہوئے ۔ پہلے شہابِ ثاقب کے زمین پر گرنے سے کافی تباہی مچی رہتی تھی جس کی وجہ سے جانداروں نے خشکی پر بسیرا کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ آج سے کوئی چوالیس کروڑ سال پہلے ہڈی والے جانوروں نے زمین کے سینے پر جنم لیا جن میں ایک سمندری بچھو بھی تھا جس کا قد نو فٹ تھا ۔ بعض پودوں نے بھی خشکی پر زندگی بسر کرنا شروع کی یہ ابتدائی خشکی کے پودے لمبے لمبے تنے والے پودے تھے جن پر پتوں کا نشان تک نہ تھا ۔ اس کے کچھ عرصے بعد سمندر کے بعض حصے سمندر سے کٹ کر جھیلوں اور پہاڑوں کی شکل میں زمین پر پھیلتے گئے جن میں دنیا کا بلند ترین پہاڑ اور کوہ ہمالیہ اور الپس اور ایشیا اور مغرب میں بڑے بڑے پہاڑ زمین کے سینے میں ابھرتے گئے اور کئی جھیلیں بخارات کی شکل اختیار کرتی گئیں اور اپنے اندر پوٹاش کے ذخائر چھوڑتی گئیں ۔ اس دور میں زمین کا نصف حصہ برف میں ڈھکا ہوا تھا ۔ اس وقت جانوروں کی بہت سی نسلیں وجود میں آئیں اور بہت سی ناپید ہو گئیں ۔ .... اس وقت کی آب و ہوا ماحول کے لئے موثر نہ تھی جس کی وجہ سے درختوں کا زندہ رہنا ایک مسئلہ بن گیا مثلاً انند، چیل اور سپروس وغیرہ ۔ ماہرین کے مطابق ان کی لمبائی دو فٹ سے لیکر دو سو فٹ تک ہوتی ہے ۔

آج سے کوئی بائیس کروڑ سال پہلے ہماری زمین پر صحراؤں اور سرسبز نخلستانوں نے جنم لیا ۔ اس دور میں یورپ کے بعض حصوں میں نمکین پانی کی جھیلیں بھی منظر عام پر آئیں جن کے ارد گرد صحراؤں نے گھیراؤ کیا ہوا تھا۔ سمندر میں جابجا سنگریزے اور ریتلے پتھر جمع تھے ۔ سمندر اور خشکی میں اس وقت مچھلیوں اور بے شمار ہڈی والے جانور (Vertebrates) اور رینگنے والے جانوروں کا تسلط قائم تھا ۔ جن میں ڈائنو سار بھی شامل تھے جن کی لمبائی ایک فٹ سے لیکر نوے فٹ تک تھی ۔ یہ بول نہیں سکتے تھے ان کا وزن کم از کم

پینتیس ٹن ہوتا تھا۔ یہ جانور خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کی قوت سے محروم تھے جس کی وجہ سے ان کی نسلیں جلد ہی دنیا سے ناپید ہو گئیں۔ان جانوروں میں سیگو سار جو گھاس پھوس پر گزارا کرتا تھا اور جس کی کمر پر بڑی بڑی چھاج نما ڈھالیں تھیں، بربکیونا اور دنیا کا طویل ترین جانور ڈپلوڈاکس جس کی لمبائی نوے فٹ تھی۔ جن کی نسلیں آج دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ وقت گزرتا گیا ہماری زمین تبدیل ہوتی گئی سمندر کی جگہ خشکی نے لی۔ پہاڑ بنے اور جزیروں کی جگہ برّ اعظموں نے لی۔ برف پگھلنے لگی اور پھر بارشوں کا دور شروع ہوا۔ کرہ ارض پر لاکھوں کی تعداد میں جانوروں نے جنم لیا جن میں دودھ پلانے والے جانور بھی شامل تھے۔ یورپ اور وسطی امریکہ اور ایشیا کی مختلف جگہوں میں انقلابی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ پھر انسان نے جنم لیا اور آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے دنیائے قدیم کا دور ختم ہوا اور دنیائے جدید کا آغاز ہوا۔ انسان نے غاروں سے نکل کر کھیتی باڑی شروع کی۔ غاروں میں رہنے والا انسان گھاس پھوس اور جنگلی جانوروں کا شکار کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا اور وہ ہر وقت تیر و کمان ساتھ رکھتا تھا۔اس کے بال اور ناخن بڑھے ہوئے ہوتے۔ پتھر اور دھات کے زمانے دنیائے قدیم کے ابتدائی زمانے تھے۔ اس وقت انسان کے اندر تہذیب و تمدن کا تصور تک نہ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ انسان نے اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھالنا شروع کیا۔ لباس، رہن سہن اور دیگر معاملات میں انسان کے اندر وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی گئی اور سب سے پہلی ایجاد پہیہ بنا، جس نے دنیائے سائنس میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کی اور اس سے بہت سے مسائل حل ہوئے۔

سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ کرۂ ارض کا ۷۲ فیصد علاقہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے اور یہ علاقہ مختلف علاقوں کو براعظموں کی شکل میں جدا کرتا ہے۔

سمندر انسان کی غذا کا ایک موثر ذریعہ ہے قدیم انسان نے سب سے پہلے سمندر کو اپنی غذا کا ذریعہ بنایا یہ خدا کا ایک مخفی خزانہ ہے جس سے انسان روزانہ ٹنوں کے حساب سے غذا حاصل کرتا ہے۔ زمین پر چار بڑے سمندر ہیں جن میں سب سے بڑا بحر الکاہل .... بحر اوقیانوس بحر ہند اور آرکیٹک ہیں۔ بحر الکاہل ..... کے ارد گرد ... ہزاروں کی تعداد میں .... بڑے بڑے جزیرے موجود ہیں۔ الغرض ہماری زمین ایک ایسا سیارہ ہے جہاں زندگی کی رمق موجود ہے جہاں اللہ کی سب سے افضل ترین مخلوق انسان موجود ہے۔ اللہ نے اس کرہ ارض کو مختلف رنگوں سے بھرا ہے جس میں سینکڑوں اقسام کے پھل، پھول اور پودے لاکھوں اقسام کے جانور، خوبصورت پہاڑ سرسبز اور لہلہاتے کھیت اور ان میں انسان کے لئے غذا کے مختلف ذرائع موجود ہیں ان چیزوں سے دنیا کا نظام چل رہا ہے۔

انسان کا فرض بنتا ہے کہ وہ ان چیزوں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت کی بھی تیاری کرے جب اس سے ان تمام نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

پہرے دار

شبیر بیگ نازؔ

یہ ہے رات کا پہرے دار
ساری خلقت سوتی ہے، یہ
خاں صاحب کہتے ہیں اس کو
اپنا فرض نبھاتا ہے یہ
ساری بستی کا رکھوالا
پہرہ دیتا ہے یہ پھر بھی
چور اس کی آواز کو سن کر
کام تو اتنا سخت ہے لیکن
پھر بھی اتنا صابر ہے کہ

کام بہت اِس کا دُشوار
شب بھر رہتا ہے بیدار
پہنے رہتا ہے شلوار
چاہے ہو کتنا بیمار
ہر دم چوکس اور ہُشیار
مینہہ ہو چاہے مُوسلادھار
چپکے سے ہو جائے فرار
تنخواہ اس کی نصف ہزار
ہر دَم رب کا شکر گزار

نازؔ نہ گر رکھوالا ہوتا
چوروں کی ہوتی بھر مار

علم و ادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز۔ کراچی فون:- ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا فون:- ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور فون:- ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور فون:- ۲۹۵۷
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی فون:- ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم فون:- ۰۵۹۴۱
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد فون:- ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان فون:- ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار، پشاور فون:- ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	وہاڑی نیوز ایجنسی۔ ریل بازار وہاڑی
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان فون:- ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ
فیاض بک ڈپو۔ فیصل آباد فون:- ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ
سعید بک اسٹال۔ گجرات فون:- ۰۴۳۳۱	مسلم بک ڈپو۔ سرائے عالمگیر
سلمان برادرز۔ نواب شاہ فون:- ۲۴۱۴	
یونائیٹڈ بک لینڈ۔ سکھر	ایم۔ ایم ٹریڈرز۔ کوئٹہ

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن مینیجر
"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۲، نورس روڈ، سائٹ کراچی ۱۶

چمک دار ستارہ

بن یامین

ایک زور دار چھپاکے کے ساتھ پتھر گندے پانی میں گرا اور آس پاس کھڑے لوگوں کے کپڑے بری طرح بھیگ گئے۔ لوگوں نے پلٹ کر دیکھا تو اسکول کا یونیفارم پہنے شیطانوں کی ایک ٹولی پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ بڑی عمر کے بزرگ حضرات تو منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئے۔ جو ذرا جوان تھے وہ ان بچوں کے پیچھے بھاگے مگر ان کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔

پورا علاقہ ان بچّوں کی حرکتوں سے عاجز تھا۔ نت نئی شرارتیں کرنا ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ بلکہ شرارتیں بھی کیا، بدتمیزی کرنا۔ کیونکہ شرارتیں بچّوں کی فطرت اور ان کا حق ہوتی ہیں۔ شرارتیں کسی کو بری نہیں لگتیں لیکن اگر یہ حد سے بڑھ جائیں تو ان کا شمار بدتمیزی میں ہوتا ہے۔

کوئی دن ایسا نہ گذرتا تھا جب لوگ ان بچّوں کی حرکتوں سے پریشان نہ ہوتے تھے۔ کبھی کسی کی کال بیل دبا کر بھاگ گئے تو کبھی کسی کو دھکا دے کر۔ کبھی کسی ضعیف آدمی کو بیچ سڑک پر لا کر چھوڑ دیا تو کبھی کسی پھیری والے کی کوئی چیز اٹھا کر بھاگ دوڑ لئے۔ دن کا کوئی وقت ایسا نہ ہوتا تھا جب شرارتیں ان کے ذہن میں کلبلاتی نہ ہوں۔ اس وقت بھی یہ بچے اسکول سے آرہے تھے۔

اپنے گھروں کے قریب پہنچ کر ان بچوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور اپنے اپنے گھروں کو

روانہ ہوگئے۔

شیطانوں کی اس ٹولی نے باقاعدہ اپنا ایک لیڈر بھی منتخب کر رکھا تھا اور اس لیڈر کا نام تھا ثاقب۔ اس کا پورا نام تو نجم الثاقب تھا مگر اس کو سب لوگ ثاقب کہتے تھے۔ وہ پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اس ٹولی کی قیادت کے لئے جو صلاحیتیں درکار تھیں وہ اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس کا ذہن منصوبے بنانے اور ان کو عملی جامہ پہنانے میں بہت تیز تھا۔ وہ انتہائی درجہ کا خود سر اور بد تمیز لڑکا تھا۔

ثاقب اپنے گھر میں سب سے بڑا تھا۔ اس سے چھوٹی اس کی بہنیں تھیں۔ جن پر اسے صرف حکم چلانا آتا تھا۔ اپنے گھر کے پاس پہنچ کر ثاقب نے دروازے میں لات ماری اور گھر میں داخل ہوگیا۔ اپنا بستہ ایک طرف پھینکا اور سیدھا باورچی خانے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ جہاں اس کی امی کھانا پکا رہی تھیں۔

"امی کھانا" اس نے نعرہ مارا۔

"مگر بیٹا پہلے یونیفارم بدل لو۔" اس کی امی نے جواب دیا

"مگر مجھے سخت بھوک لگی ہے۔" ثاقب نے اصرار کیا۔

"بہت بری بات ہے ثاقب۔" امی بولیں۔ "تم جب تک یونیفارم بدل کر نہیں آتے، میں تم کو کھانا نہیں دوں گی۔ ویسے بھی کھانا ابھی پوری طرح نہیں پکا ہے۔"

ثاقب بادل نخواستہ وہاں سے کپڑے بدلنے کے لئے چلا گیا۔ اس کی چھوٹی بہن مریم کمرے میں اسکول کا کام کر رہی تھی۔ ثاقب نے اس کی پینسل چھین کر الماری کے پیچھے پھینک دی اور خود تیزی سے بھاگتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا۔

کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلا تو مریم امی کے پاس اپنا دکھڑا لے کر بیٹھی تھی۔

"ثاقب اس کی پینسل نکال کر دو" امی نے اسے ڈانٹا

"اچھا ابھی کھانے کے بعد نکال دوں گا" اس پر جیسے ڈانٹ کا اثر ہی نہیں ہوا۔ ثاقب کھانے بیٹھ گیا۔ اور کھانا کھاتے ہی گھر سے باہر یہ جا وہ جا۔ ثاقب کی امی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ناک میں دم کر دیا تھا اس لڑکے نے۔ انہوں نے ثاقب کو سمجھانے کے لئے ہر طریقہ آزمایا تھا مگر ثاقب پتا نہیں کس مٹی کا بنا ہوا تھا اس پر کسی چیز کا بالکل اثر نہیں ہوتا تھا۔

ثاقب میں لاکھ برائیاں سہی لیکن ایک خوبی اس میں یہ تھی کہ وہ اسکول اور قرآن پڑھنے باقاعدگی سے جاتا تھا۔

شام کے قریب وہ گھر واپس آیا اور سپارا لے کر مسجد کی طرف روانہ ہوگیا۔

ثاقب مسجد سے واپس آیا تو اس کی امی کپڑے سی رہی تھیں۔

"امی۔ امی" ثاقب نے بڑے جوش میں آواز دی۔

"کیا ہے؟" امی نے لاپرواہی سے کہا۔

"پتا ہے میرا نام قرآن میں آیا ہے۔"

"اچھا؟" امی نے جیسے سنی ان سنی کر دی۔

"امی پتا ہے اللہ میاں نے میرے نام کی قسم کھائی ہے۔" ثاقب نے بتایا۔

"اچھا۔"

"امی پتا ہے نجم الثاقب کا کیا مطلب ہوتا ہے؟" ثاقب نے استفسار کیا۔

"کیا ہوتا ہے بھئی۔" امی کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"چمکتا ہوا ستارہ۔" ثاقب نے خوش ہو کر بتایا۔

"اچھا۔" امی نے بے نیازی سے کہا۔

"مگر امی میں چمکتا تو نہیں ہوں۔" ثاقب نے اپنے سراپے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اس لئے کہ آپ ایسے کام جو نہیں کرتے۔" امی نے جواب دیا۔

یہ گفتگو تو خیر یہیں ختم ہوگئی، لیکن ثاقب کے ذہن میں یہ بات پھانس کی طرح اٹک گئی کہ وہ کیوں نہیں چمکتا۔ اور اس دن تو ثاقب کافی دیر تک خوب رگڑ رگڑ کر نہایا۔ اپنے چہرے پر ڈھیر سارا پاؤڈر تھوپ کر اُس نے آئینہ دیکھا تو ستارے والی چمک اس کو پھر بھی نظر نہ آئی۔

.... ○ ....

اب اس کے ذہن میں بس ایک ہی دھن تھی کہ کسی طرح وہ بھی ستاروں کی طرح چمکنے لگے۔ پہلے اس سے کوئی نام پوچھتا تو وہ صرف "ثاقب" بتایا کرتا تھا لیکن اب وہ بڑے فخر سے "نجم الثاقب" کہا کرتا تھا اور ساتھ ہی اس کا اردو ترجمہ بھی بتاتا تھا۔

اس کا گروہ اب بھی انہی شرارتوں میں مصروف رہتا لیکن ثاقب کا ذہن اسی سوچ میں مصروف رہتا کہ وہ چمکدار ستارہ بننے کے لئے کیا جتن کرے۔ یہ مسئلہ اس نے شیطانوں کی ٹولی کے سامنے بھی پیش کیا۔

اس کے ساتھیوں نے طرح طرح کہ مشورے دینے شروع کر دیئے۔

ایسے مشورے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر اور نہ ہی وہ قابل عمل تھے۔

ثاقب کو سب سے اچھا مشورہ فیصل کا لگا جس نے کہا تھا۔

"دیکھو بھئی! عمران خان، وسیم اکرم وغیرہ سپر اسٹار کہلاتے ہیں یعنی یہ ہمارے ملک کے رخشندہ ستارے ہیں۔ ایسا کرو تم بھی کرکٹ کھیل کر ملک میں اپنا نام پیدا کرو اور ان کی طرح ایک سپر اسٹار بن جاؤ۔"

ثاقب کو یہ مشورہ اتنا بھایا کہ اس نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بس اگلے ہی دن سے ثاقب تھا اور میدان تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی واحد اچھی عادت یعنی باقاعدگی سے اسکول جانا بھی چھوٹ گیا۔ صبح شام کرکٹ اور دن رات کرکٹ۔ گھر والے اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

اس پر جیسے کرکٹ کھیلنے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ لیکن اب بھی اسے جہاں موقع ملتا وہ بدتمیزیاں کرنے سے باز نہ آتا تھا۔ اتنی کرکٹ کھیل کر اس کی کرکٹ تو خیر کیا اچھی ہوتی جو رہی سہی پڑھائی تھی وہ اس سے بھی جاتا رہا۔

ہوش تو اس کو اس وقت آیا جب ششماہی امتحانات کا نتیجہ اس کے ہاتھ میں دیا گیا۔ وہ فیل ہو گیا تھا۔

ثاقب گھر آیا تو اتنی شاندار ڈانٹ پڑی کہ اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس پر گھر سے نکلنے پر پابندی لگ گئی۔

ایک ستارہ روشن ہونے سے پہلے ہی بجھ کر رہ گیا۔ اب ثاقب ہر وقت اداس رہتا تھا۔

ایک دن اس کے سعید ماموں ان کے گھر ملنے آئے۔ انہوں نے ثاقب کو اتنا ملول دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ قبل اس کے وہ کچھ پوچھتے ثاقب کی چھوٹی بہن میمونہ نے سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" سعید ماموں مسکرائے۔

"ثاقب میں تم سے کچھ سوالات پوچھتا ہوں۔ ان کے جواب دو گے" سعید ماموں بولے۔

"جی پوچھیے۔"

"تمہیں تحریک پاکستان کے رہنماؤں کے نام یاد ہیں؟"

ثاقب کو حیرانی ہو رہی تھی کہ یہ سوال اچانک کہاں سے ٹپک پڑا۔ تاہم ان رہنماؤں کے نام تو اس طرح یاد تھے جیسے اس کا اپنا نام۔ اس نے فر فر سب کے نام گنوا دیئے۔

"اچھا اب بتاؤ کہ تمہیں مسلم سپہ سالاروں کے نام یاد ہیں؟"

ثاقب کو حیرانی ہو رہی تھی کہ سعید ماموں آخر کس قسم کے سوالات کر رہے ہیں۔ سوال چونکہ آسان تھا ثاقب نے اس کا جواب بھی فوراً دے دیا۔

"اچھا اب تاریخ کے مشہور علماء کے نام بتاؤ" ماموں نے ایک سوال اور کیا ثاقب نے ان کے نام بھی فوراً گنوا دیئے۔

"اب میں ایک سوال اور پوچھتا ہوں" ماموں نے کہا "یہ بتاؤ پاکستان کی ابتدائی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں کے نام کیا تھے؟"

ثاقب بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ یہ سوال خاصا مشکل تھا۔

"مجھے نہیں معلوم" ثاقب نے کہا

"بھئی یہ اپنے وقت کے سپر اسٹار کہلاتے تھے" سعید ماموں نے کہا۔

"آخر ان کی چمک دمک کدھر گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی جتنی چمک تھی وہ سب عارضی تھی۔ تو یہ رخشندہ ستارے کیسے ہوگئے؟ ستارے تو ہمیشہ چمکتے رہتے ہیں۔"

ثاقب سر جھکائے سعید ماموں کی بات سنتا رہا۔

"اس کے برعکس تم نے ہزاروں سال پہلے کے علماء اور جرنیلوں کے نام فوراً بتادیئے۔ درحقیقت ہماری تاریخ کے رخشندہ ستارے تو یہی ہیں جو سینکڑوں سال سے اسی آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہے ہیں"

بات کچھ کچھ اب ثاقب کی سمجھ میں آنے لگی تھی لیکن ثاقب سوچنے لگا کہ میں تو ابھی بچہ ہوں اتنے بڑے بڑے کارنامے کیسے انجام دے سکتا ہوں؟۔ اس نے یہ سوال سعید ماموں کے سامنے رکھ دیا۔

"تم ان شخصیات کے بچپن کا مطالعہ کرو کہ ان کا طرز عمل کیسا تھا"

انہوں نے کہا "ویسے بھی تم اپنی حد تک تو کام کرسکتے ہو کہ اپنی اس شیطانوں کی ٹولی کو راہ راست پر لے آؤ اور بجائے لوگوں کو تنگ کرنے کے ان کی بھلائی کے کام کرکے ان لوگوں کی دعائیں سمیٹو جن کی ابھی تک تم نے صرف بد دعائیں لی ہیں"

بات اب ثاقب کے پوی طرح سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے اسی دن سے مطالعہ کرنا شروع کردیا۔

.... ○ ....

سب لوگ حیران تھے کہ ثاقب اور اس کے ساتھیوں کی یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی ہے۔ ان بچوں کی ٹولی اب "اچھے ساتھی" کے نام سے مشہور تھی اور ان کے ممبروں کی تعداد میں اب مستقل اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کا نصب العین تھا "نیک بنو۔ نیکی پھیلاؤ"۔ جس پر وہ پوری طرح سے عمل پیرا تھے۔ ان کی تنظیم مختلف فلاحی کام کرتی نظر آتی تھی۔

ثاقب کے گھر والے بھی بہت خوش تھے۔ خود ثاقب بہت خوش تھا۔ پہلے وہ جب کسی کو تنگ کرتا تھا اس کو خوشی ہوتی تھی لیکن ساتھ ایک پچھتاوہ بھی۔ لیکن اب ان ہی لوگوں کو سکھ دے کر اس کو جو اطمینان اور خوشی حاصل ہوتی تھی اس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

اب کبھی ثاقب آئینہ دیکھتا ہے تو خوشی اور اطمینان کے باعث اسے اپنا چہرہ چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ بالکل کسی نجم الثاقب کی طرح۔

سوچیے تو!!
خدانخواستہ جان پر بن آئے
اور خون کے بنا کوئی چارہ نہ ہو
آج آپ
کسی کو خون کا عطیہ دیجئے
کل کوئی
آپ کے کام آئے گا۔
منجانب
جملہ اقسام کی چھپی ہوئی تھیلیاں اور شاپنگ بیگ تیار کرنے والا معروف ادارہ
جیلانی انڈسٹریل کارپوریشن (پرائیویٹ) لمیٹڈ
F. 312 - سائیٹ کراچی۔ فون نمبر ۲۹۵۶۷۹،۸۹ - ۲۹۷۱۶۱ - فیکس ۴۱۳۴۴۸

ایک تبادلہ جس نے کسانوں کی زندگی کو تبدیل کر دیا

شاھنواز فاروقی

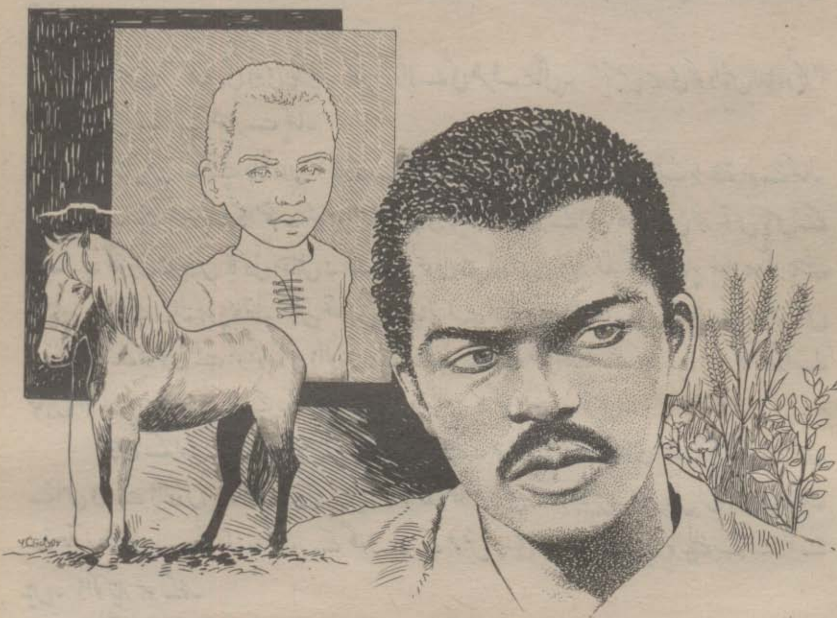

اوزارک کا پہاڑی سلسلہ رات کی گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور ان پہاڑیوں کے درمیان واقع گاؤں میں ہر طرف خاموشی تھی۔ گاؤں کے اندر موجود بہت سے فارموں اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے کھیتوں پر سناٹے کا راج تھا۔

کارور نام کے کسان کے فارم پر پر امن فضا طاری تھی۔ کارور اور اس کی بیوی فارم ہاؤس میں سوئے پڑے تھے۔ ان کی غلام سیاہ فام میری اپنے بیمار بچے کے ساتھ فارم ہاؤس کے لان میں بنے ہوئے لکڑی کے کیبن میں لیٹی ہوئی تھی۔

اچانک رات کی اس تاریکی میں فارم ہاؤس کے قریب گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ پھر رفتہ رفتہ ان ٹاپوں کے ساتھ انسانی آوازیں بھی ابھرنے لگیں۔ اس سب کا مطلب یہ تھا کہ نائٹ رائڈرز آ پہنچے تھے۔ لیکن یہ لوگ گھوڑے یا دوسرے جانور چرانے نہیں آئے تھے بلکہ وہ تو غلاموں کو اٹھا کر لے جانے آئے تھے۔ امریکہ میں اگرچہ غلامی کا دور ختم ہو رہا تھا۔ مگر اب بھی غلاموں کی خرید و فروخت ایک عام بات تھی۔ صحت مند سیاہ فام غلام اچھے داموں فروخت ہوتے تھے۔

ایک خوفناک چیخ نے کارور کو نیند سے بیدار کر دیا۔ مگر اس سے قبل کہ وہ بیدار ہو کر اپنے دالان میں بنے کیبن تک پہنچتا کیبن خالی ہو چکا تھا۔ محنتی اور شریف میری اپنے بیمار بچے کے ساتھ غائب تھی۔

"میری" کارور کی بیوی چلّائی۔ اور دروازے کی طرف بھاگی۔ "ہمیں میری کو واپس لانا ہو گا" کارور کی بیوی نے اپنے شوہر سے کہا۔

"میں ان کے پیچھے جاتا ہوں" کارور نے تیزی کے ساتھ اپنے اصطبل کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک ایسے گھوڑے کا انتخاب کیا جو انتہائی تیز دوڑتا تھا۔ اتنا تیز کہ اس گاؤں میں اور آس پاس کے بہت سے گاؤوں میں اس کا کوئی مقابل نہ تھا۔ چند لمحوں میں وہ اس برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر نائٹ رائڈرز کے پیچھے روانہ ہو چکا تھا۔ لیکن تھوڑی دور جا کر اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی بیمار ہے۔ لہٰذا اس نے گاؤں کے لوگوں سے جو خود بھی ڈاکوؤں کے تعاقب کے لئے نکل چکے تھے کہا کہ وہ اس کا گھوڑا لے جائیں اور میری اور اس کے بچے کے عوض ڈاکوؤں کو اس کا گھوڑا دے آئیں۔

گاؤں کے لوگ ڈاکوؤں کا پیچھا کرتے ہوئے چلے۔ اور جلد ہی وہ ڈاکوؤں تک پہنچ گئے۔ انہوں نے اس ڈر سے ڈاکوؤں پر فائرنگ نہ کی کہ کہیں اغواء شدہ غلام زخمی نہ ہو جائیں۔ بہرحال ان میں سے ایک نے چلّا کر ڈاکوؤں سے کہا کہ وہ کارور کے گھوڑے کے عوض میری اور اس کے بچے کو لینے کے لئے آئے ہیں۔ ڈاکو تیار ہو گئے۔

"گھوڑے کو سامنے والے درخت سے باندھ کر خود چھ سو قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو جاؤ۔ ہمارے فائر کی آواز سن کر درخت کے قریب آنا تمہیں میری اور اس کا بچہ مل جائیں گے۔" ڈاکوؤں نے اعلان کیا۔

گاؤں کے لوگوں نے گھوڑے کو درخت سے باندھ دیا اور خود چھ سو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو

گئے۔ اس وقت بارش ہو رہی تھی اور آسمان پر ہر طرف کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کو ڈاکوؤں پر اعتبار نہیں تھا مگر ان کے پاس ڈاکوؤں پر اعتبار کرنے کے علاوہ چارہ نہیں تھا۔ وہ انتظار کرنے لگے۔ بالآخر فائر کی آواز فضا میں گونجی۔ سب نے گھوم کر درخت کی طرف دیکھا۔ ڈاکو گھوڑوں پر سوار بھاگے چلے جا رہے تھے۔

گاؤں کے سب لوگ درخت کے پاس پہنچے۔ کارور کا گھوڑا غائب تھا۔ اور درخت کے نیچے ایک بھیگی ہوئی ٹھنڈی سے پوٹلی رکھی ہوئی تھی۔ یہ میری کا چھوٹا سا بچہ تھا۔ جو اس وقت سردی سے کانپ رہا تھا۔ وہاں پر میری کا نام و نشان نہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈاکو انہیں دھوکہ دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ ڈاکو اب تک میلوں دور نکل چکے تھے۔

چند روز بعد گاؤں کے لوگ بچہ کو لے کر کارور کے پاس پہنچے اور اسے سارا قصہ سنایا۔

"تم میرے گھوڑے کا تبادلہ کر کے یہ بچہ لائے ہو؟" کارور نے غصہ میں بھر کر پوچھا۔ "تم نے میرا قیمتی گھوڑا دے دیا۔ اس بیمار اور سیاہ فام بچے کے لئے ...... واہ کیا تبادلہ کیا ہے تم لوگوں نے" کارور نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

لیکن کارور کی بیوی نے اس کانپتے ہوئے بچے کو گود میں لے لیا اور پھر اس کے کپڑے بدل ڈالے۔ لگ رہا تھا کہ بچہ بس اب مر ہی جائے گا۔ مگر کارور کی بیوی کی توجہ نے اسے چند روز میں ہی ٹھیک کر دیا۔

کارور تو اس بچے سے کبھی کبھی ہی بولتا تھا، مگر اس کی بیوی اس سے بہت پیار کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ اس کی بہت سی باتیں سمجھنے لگی۔ اس نے اس بچے کا نام "جارج واشنگٹن کارور" رکھ دیا۔

جارج ایک تنہا بچہ تھا۔ کیونکہ گاؤں اس کے گھر سے تھوڑے فاصلہ پر تھا، چنانچہ اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ دوسرے بچے بول سکتے تھے مگر جارج بول نہیں سکتا تھا۔ یوں جارج تنہا پھرتا رہتا۔ وہ خرگوشوں اور گلہریوں کے ساتھ کھیلتا۔ وہ گھاس کے اندر ادھر ادھر پھدکتے ہوئے کیڑے مکوڑوں کو بڑے غور سے دیکھتا۔ اور بڑے شوق سے جنگلی پھول جمع کرتا۔ جارج جنگل سے پودے کھود کر لاتا اور انہیں کارور کے باغیچہ میں بو دیتا۔ اس کے لگائے ہوئے پھولوں کے پودے دوسرے تمام پودوں سے زیادہ اور خوبصورت پھول کھلاتے اور وہ بڑھتے بھی بہت تیزی کے ساتھ تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے جارج کے ہاتھوں میں کوئی جادو ہے۔

دس سال کی عمر میں جارج نے اسکول جانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک پرانی سی کتاب سے کچھ پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اب تھوڑا سا بول بھی لیتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کی آواز اب بھی بہت

معدوم اور الجھی ہوئی سی تھی۔ کالے بچوں کا اسکول وہاں سے خاصا دور تھا۔ اسکول میں فیس لی جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جارج کو نہ صرف یہ کہ اپنے رہنے کا علیحدہ بندوبست کرنا تھا بلکہ اسے اب شام میں کہیں کام کاج بھی تلاش کرنا تھا۔ لیکن وہ ہر قیمت پر پڑھنا چاہتا تھا۔

مسٹر کارور نے اسے اسکول والے گاؤں میں لے جانے کا وعدہ کر لیا۔ مگر جب وقت آیا تو وہ اس کے ساتھ نہ جا سکے۔ چنانچہ جارج اکیلا ہی روانہ ہو گیا۔

کارور کی بیوی اس کے جانے سے اداس ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی معلوم نہیں اب یہ کبھی لوٹ کر واپس آئے گا یا نہیں تو وہ دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ دس برس کے بجائے سات آٹھ سال کا بچہ لگ رہا تھا۔ وہ دبلا پتلا اور اپنی عمر کے بچوں سے قد میں چھوٹا تھا۔ وہ اپنے استعمال کی چند چیزوں کو ایک گٹھری میں لپیٹ کر اسے ایک لاٹھی میں لٹکائے ہوئے تھا۔ لاٹھی اس کے کندھے پر رکھی تھی۔ لاٹھی میں اس کے نئے جوتے ٹنگے ہوئے تھے۔ وہ آج اس گھر کو چھوڑ رہا تھا جو اس دنیا میں ان کا واحد گھر تھا۔ اس کا دل دکھی اور اداس تھا۔

اس چھوٹے سے گاؤں میں جہاں اسکول واقع تھا جارج رات گذارنے کے لئے ٹھکانا تلاش کر رہا تھا۔ وہ تھکا ہوا تنہا اور بے یار و مددگار تھا۔ اچانک نہ جانے کہاں سے ایک بڑا سا کتا آیا اور اس کے پاؤں سونگھنے لگا اور پھر اس کے ساتھ ہولیا۔ تھوڑی دیر کی تلاش کے بعد جارج کو ایک گھر کے پیچھے ایک چھپّر نظر آیا۔ جارج چھپّر کے نیچے پڑے ہوئے گھاس پھوس میں جالیٹا۔ کتا بھی اس کے پاس آ بیٹھا۔ جارج نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر کتے کا پنجہ پکڑ لیا۔ اسے لگا کہ اب وہ تنہا نہیں ہے۔ چند لمحوں بعد اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

سردیوں کی تمام سخت راتیں جارج نے اسی چھپر کے نیچے گذاریں۔ وہ لوگوں کے طرح طرح کے کام کرتا۔ اور اتنے پیسے جمع کرتا کہ اس کے اسکول کی فیس اور اس کے کھانے پینے کا بندوبست ہو سکے۔ وہ باقاعدگی سے اسکول جاتا تھا۔ مگر ابھی تک اس کا ایک بھی دوست نہیں بن سکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکول کے بچے اس کی بھنبھناتی ہوئی آواز پر ہنستے۔ حتیٰ کے استادوں کو بھی اس کی بات سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی۔ جارج کے لئے زندگی بڑی مشکل تھی۔ وہ اکثر بھوکا رہتا۔ رات کو سردی کے مارے اکڑ جاتا۔ مگر اب وہ آہستہ آہستہ وہ باتیں سیکھنے اور پڑھنے لگا تھا جن کے سیکھنے اور پڑھنے کی اس میں شدید خواہش تھی۔ اب وہ تھوڑا بہت لکھ اور پڑھ سکتا تھا۔ اسے تصویریں بنانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ چڑیوں، خرگوشوں، پھولوں غرضیکہ ان تمام چیزوں کی تصاویر بناتا جو اس نے اپنے گاؤں میں دیکھی تھیں۔

اب موسمِ بہار آگیا تھا۔ اور موسم بہار کے ساتھ ایک انوکھی بات ہوئی۔ یعنی جارج کی زندگی میں ایک تبدیلی آئی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" ایک شام جارج سے ایک شخص نے پوچھا۔ یہ مسٹر مارٹن کی آواز تھی جو اس چھپّر کے مالک تھے۔ انہوں نے وہاں سے گذرتے ہوئے دیکھا تھا کہ ایک کمزور سا بچہ گھاس پھوس پر لیٹا ہوا ہے۔

جارج مسٹر مارٹن کی آواز سنتے ہی اٹھ بیٹھا اور مارے خوف کے رونے لگا۔ مگر مسٹر مارٹن ایک رحمدل انسان تھے۔ ان کے دل میں غلاموں کے لئے بڑی جگہ تھی۔ چنانچہ وہ جارج کو اپنے گھر لے گئے۔ یہاں آکر جارج نے گذشتہ کئی ماہ میں پہلی بار اچھا کھانا کھایا۔ انہوں نے جارج کو اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ اس گھر میں جارج کو رہنے کے لئے ایک کمرہ، کھانے کو اچھا کھانا اور پہننے کو اچھے کپڑے میسر آئے۔ اس کے بدلے میں جارج ان کا کھانا پکاتا اور ان کے باغیچہ کی دیکھ بھال کرتا۔ ایک بار مسٹر مارٹن بیمار ہوئے تو اس نے ان کی بڑے اچھے طریقے سے دیکھ بھال کی۔ مسٹر مارٹن اور ان کی بیوی جارج سے بہت خوش تھے۔

"بہت ذہین بچہ ہے" مسٹر مارٹن نے ایک روز اپنی بیوی سے کہا۔ وہ جارج کو پڑھاتے اور اس سے بہت دیر تک گفتگو کرتے۔ انہوں نے جارج کو ان اسکولوں کے بارے میں بتایا جہاں وہ اس اسکول سے زیادہ بہتر انداز میں تعلیم حاصل کر سکتا تھا۔ جارج کی اسکول کی رپورٹ بڑی اچھی تھی۔ اگرچہ وہ جغرافیہ اور تاریخ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا مگر اس کا مطالعہ اچھا تھا۔ اور اس کی ڈرائنگ تو بہت ہی اچھی تھی۔ فطرت اور اس کے مظاہر کے بارے میں جارج کی معلومات اپنے تمام استادوں سے بھی زیادہ تھیں

کچھ دنوں تک جارج کی زندگی ٹھیک ٹھاک طریقے سے گذرتی رہی۔ مگر پھر ایک روز مسٹر مارٹن کا وہ مل بند ہو گیا جہاں مسٹر مارٹن کام کرتے تھے۔ وہ اب کسی اور جگہ کام کی تلاش میں تھے۔ چند دنوں بعد دور کی ریاست کیلی فورنیا میں انہیں ایک کام ملا۔ چونکہ ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی اس لئے انہیں اتنی دور بھی ملازمت کے لئے جانا ہی پڑا۔ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ جارج کو بھی اپنے ساتھ لے جا سکتے۔ چانچہ انہوں نے جارج کو اپنے ایک پڑوسی کے یہاں چھوڑا۔ جاتے جاتے انہوں نے جارج کو کسی اچھے اسکول میں جانے کی ہدایت کی۔

مارٹن کی روانگی کے وقت جارج بہت اداس تھا۔ وہ بہت دیر تک مارٹن کو لے کر جانے والی گاڑی کو تکتا رہا۔ مارٹن سے اس کی دوستی کا یہ تیسرا سال تھا۔

چند ماہ بعد جارج دوسرے گاؤں میں واقع ایک اچھے اسکول میں داخل ہو گیا۔ جارج کی خواہش تھی کہ وہ کتابوں میں لکھی ہوئی ہر بات سمجھ لے۔

اگلے چند برس جارج کی زندگی کی تبدیلیوں کے سال تھے۔ جارج نے کچھ دنوں کے بعد اپنا دوسرا اسکول بھی چھوڑ دیا۔ اب وہ ایک ہائی اسکول میں داخل ہو گیا تھا۔ زندہ رہنے کے لئے وہ کئی کام کرتا رہا۔

اس نے کچھ دنوں تک ایک ہوٹل میں بھی کام کیا۔ چھٹی کے دنوں میں وہ ایک شہر سے دوسرے شہر اور دوسرے شہر سے تیسرے شہر کا سفر کرتا۔ اور طرح طرح کے کام کرتا۔ وہ جہاں بھی جاتا ہر دل عزیز ہو جاتا۔ وہ تھا جو اتنا اچھا۔ یوں جارج نئی زمینوں اور نئے لوگوں سے ملتا رہا۔ بالآخر اس کے اسکول کے دن ختم ہو گئے۔

اسکول کے اختتام پر اس نے سوچا کہ اب کارور اور اس کی بیوی سے جا کر ملنا چاہئے۔ اسے اپنا ماضی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے پیدائشی گاؤں جا پہنچا۔

کارور اور اس کی بیوی اسے دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئے۔ جارج نے انہیں اپنی زندگی کے دلچسپ قصّے سنائے تو وہ حیران رہ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک غلام کا بچہ اتنا قابل بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال اب انہیں خود پر بھی فخر محسوس ہو رہا تھا۔ جارج اس رات اسی کیبن میں سویا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ وہ بہت دیر تک آسمان کو تکتا رہا۔ اس کی زندگی ایک فلم کی طرح اس کی نظروں میں گھوم رہی تھی۔

اس نے زندگی میں بہت چیزیں سیکھی تھیں۔ سوال یہ تھا کہ اب وہ کیا کرے؟

اس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ اسے ابھی اور کتابیں پڑھنی ہیں۔ اور اسے اور بہت کچھ سیکھنا ہے۔

"مجھے کالج میں داخلہ لینا چاہئے۔" اس نے طے کیا۔ "پھر اس کے بعد میں شاید کوئی بڑا کام کرنے کے قابل ہو سکوں" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

بے شک دنیا کے بہت سے بڑے کام جارج کی توجہ کے مستحق تھے۔ جارج واشنگٹن کا دور آج بھی ایک عظیم آدمی کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی زندگی کی کہانی بلاشبہ اتنی طویل ہے کہ اس کے لئے ایک پوری کتاب کی ضرورت ہے۔

بہرحال۔ جب جارج کالج میں داخلہ لینے گیا تو اسے داخلہ دینے سے انکار کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ ایک نیگرو یعنی سیاہ فام تھا۔ لیکن کئی برسوں کی محنت اور کوشش کے بعد اسے کسی اور جگہ داخل مل ہی گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس مضمون کا خاص طور پر مطالعہ کرے۔ وہ موسیقی پڑھ سکتا تھا۔ کیونکہ اس بارے میں اس کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ اور کچھ برسوں سے محنت کے نتیجہ میں وہ بہت اچھا گانے بھی لگا تھا۔ وہ آرٹ پڑھ سکتا تھا کیونکہ وہ بہت ہی خوبصورت تصاویر بناتا تھا۔ وہ نباتیات (Botany) اور زراعت پڑھ سکتا تھا کیونکہ فطرت کی معمول باتوں کے بارے میں جتنا وہ جانتا تھا شاید ہی اور کوئی جانتا ہو۔

بہرحال وہ ایک سائنس دان کے طور پر مشہور ہوا۔ ایک ایسے سائنس دان کے طور پر جس نے زمین، درختوں اور پھولوں پر کام کیا اور جس نے کسانوں کو تحریک دی کہ وہ ایک زمین پر ایک کے بجائے

کئی فصلیں آباد کریں۔ اس نے کسانوں سے کہا۔
"آپ ہر سال کپاس اگاتے ہیں جو آپ کی زمین کی ساری قوتیں ہضم کر جاتی ہے اور زمین کو واپس کچھ بھی نہیں دیتی۔ کپاس کی فصل کے بعد زمین کو تھوڑے آرام اور توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ لوگ کپاس کے بعد اپنی زمینوں پر ایسی فصل کاشت کیا کریں جو زمین کو کچھ قوت فراہم کر سکے۔ جیسے مونگ پھلی کی فصل"

"مونگ پھلی" تمام کسان اس مشورہ پر حیران رہ گئے۔ "جناب مونگ پھلی تو سووروں کے علاوہ کسی اور کے کام کی نہیں ہوتی۔" کسانوں نے کہا۔

"نہیں بھائی! دنیا کی کوئی چیز بھی بیکار نہیں ہوتی۔" جارج نے جواب پی ایچ ڈی ڈاکٹر بن چکا تھا انہیں بتایا۔ پھر ڈاکٹر جارج نے کسانوں کو مونگ پھلی سے کافی، دودھ، آٹا، کاغذ اور تختے وغیرہ بنانے کے بارے میں بتایا۔ اس نے انہیں بتایا کہ مونگ پھلی سے ایک نہیں بلکہ تین سو مختلف اشیاء بنائی جا سکتی ہیں۔

جارج نے کسانوں کو بتایا کہ فصلوں کی بیماریوں سے کس طرح نپٹا جائے؟ اس نے انہیں سکھایا کہ زمین سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کس طرح حاصل کیا جائے؟ اس نے اپنے بھائیوں یعنی سیاہ فاموں کی زندگی میں امید کی نئی کرن پیدا کی اور عام کسانوں کے لئے خوشحالی کی۔

ایک روز یہی بچہ ایک گھوڑے کے تبادلہ میں حاصل ہوا تھا۔ "وہ بھی کیا تبادلہ تھا؟" کارور نے جارج کی شہرت کے بہت دنوں بعد ایک دن سوچا۔

"واقعی وہ عجیب تبادلہ تھا" اس کی بیوی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا تھا۔

بجلی کا ڈسا مانگے نہ پانی

بجلی کے ننگے تار اور پلگ وغیرہ

سانپ سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہیں۔ بجلی کے تاروں اور سوئچ بورڈ وغیرہ کو کھلونا نہ جانیئے۔ ان سب سے دُور رہیئے۔ بجلی کے سامان کو احتیاط سے استعمال کیجئے۔

مطالعے مشاہدے اور ذہانت کا ماہانہ مقابلہ

غزل پزل

اُسامہ بن سلیم

غزل پزل کا مقابلہ نمبر ۵ آپ کی صلاحیتوں کو کھلا چیلنج ہے .... تصاویر، اسکیچز، یا علامتوں کو شناخت کرنے کے اس مقابلے میں غزل کے دس اشعار آپ کے مدد گار ہوں گے۔ جواب بھجوانے میں عجلت کا مظاہرہ نہ کیجئے بلکہ لکھنے کے بعد کسی بزرگ یا استاد کو ضرور دکھا لیجئے۔ آپ کے جوابات ماہ رواں کی ۱۵ تاریخ تک لازماً ہمیں موصول ہو جانے چاہئیں۔ درست جواب بھجوانے والے تین ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعام بھی دیا جائے گا۔ جواب کے ہمراہ کوپن کا آنا ضروری ہے جو صفحہ نمبر ۱۴۱ پر موجود ہے۔
لیجئے مقابلہ حاضر ہے۔ (مرتب)

مقابلہ نمبر ۵

(۱) ویرانوں میں جس جا بیٹھے لمبی چپ لگ جائے
مغرب کی دنیا میں پھر بھی دانشور کہلائے

(۲) چند برسوں میں رفعت پا کر، اپنی بات بنا کر
دنیا بھر کے بازاروں میں کس نے قدم جمائے

(۳) زخموں پر جو مرہم رکھ دے اس سے اچھا کون؟
کون بھلا ایسا ہے جو ہر دکھتے دل کو بھائے

1

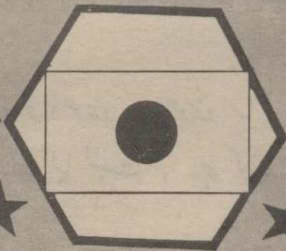
2

3

4

5

6

7

8

9

10

(۴) اس کا ظاہر کانٹے کانٹے اس کا باطن کانٹے
پھر بھی اس کو ہر اک چاہے ہر اک اسے سجائے

(۵) بیچ سمندر اس کو ڈھونڈو ، ڈھونڈو ساحل ساحل
بحری بیڑوں سے کیا نسبت ، ہے کوئی بتلائے؟

(۶) دائیں سے بائیں بھی لکھا ، بائیں سے دائیں بھی
اوپر سے نیچے کی جانب کون بھلا لکھ پائے

(۷) رکنا رکنا جانے والے ، آہستہ ہوجانا
آگے جانے کس خطرے کے سائے سے لہرائے

(۸) رنگ برنگی گیندوں والے کھیل کی میز پہ آکر
اک لمبی لکڑی سے اس نے کتنے گیند گرائے

(۹) نو سیاروں کی گنتی میں اس کا ایک مقام
کوئی بھلا ایسا بھی ہے جو اس کو بُوجھ نہ پائے

(۱۰) تھیٹر کے پردوں کو کھینچا غربت کے عالم میں
پھر ایسے شہ پارے لکھے سب ہی کو جو بھائے

مقابلہ نمبر ۴ جون ۱۹۹۰ء کے درست جوابات

۱ افلاطون ۲ لندن کا گھنٹہ گھر ۳ ڈش اینٹینا ۴ حکیم اجمل خان ۵ پیدل چلنا منع ہے
۶ اسکیمو ۷ قطب مینار ۸ بیس بال ۹ معدہ ۱۰ ڈائنوسار

انعامات حاصل کرنے والے (۳) خوش نصیب ساتھی

۱ محمد سلمان رشید، کراچی ۲ محمد شاہد، سجاول ۳ محمد عمران قادر، ٹنڈو آدم

صحیح جوابات ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام

۱ شہزاد خان، لاہور ۲ عدنان احمد صدیقی، کراچی ۳ سید آصف رضا زیدی، حیدر آباد

ایک غلطی کرنے والے ساتھیوں کے نام

(۱) شہزادہ محمد عمر، گوجرانوالہ (۲) سیما رانی، حیدر آباد سندھ (۳) رابعہ بصری، ٹنڈو الہ یار
(۴) محمد امجد ملک، ٹنڈو الہ یار (۵) محمد سلمان قریشی، اسلام آباد (۶) مریم بتول، حیدر آباد (۷) محمد عدیل، پشاور
(۸) محمد محسن مبین، کراچی (۹) محمد محسن علی قاسمی، کراچی (۱۰) مرزا فراز بیگ، حیدر آباد
(۱۱) تمثیل سرور اختر اعوان، پشاور (۱۲) سعید احمد شیخ، سکھر (۱۳) دُرِّ ثمین یوسف، کراچی
(۱۴) صدف مُغل، حیدر آباد (۱۵) فائزہ ارم بھٹو، حیدر آباد (۱۶) ظہیر الٰہی بابر، حیدر آباد
(۱۷) جنیدُ الحسن، سکھر سندھ (۱۸) محمد عثمان قریشی، اسلام آباد (۱۹) عدنان شریف مرزا، لاہور

ماچس کی ڈبیہ

منیر احمد راشد

شمع اور تنویر دونوں بہن بھائی آج گھر میں اکیلے تھے۔ ان کے امّی ابّو خالہ فریدہ کے ہاں میلاد میں گئے ہوئے تھے۔ چھوٹی منّی کو وہ ساتھ ہی لے گئے تھے اور جاتے جاتے امّی نے کہا تھا کہ جلد ہی واپس آجائیں گے لیکن اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور وہ لوگ ابھی تک نہیں آئے تھے۔

بارہ سالہ تنویر چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ شمع اس سے تین سال چھوٹی تھی اور تیسری میں پڑھتی تھی۔ دسمبر کے آخری دن، خوب کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ دونوں بہن بھائی لحاف میں دبکے ہوئے

تھے۔ تنویر اپنی چھوٹی بہن کا جی بہلانے کے لئے پچاس پیسے والی کہانی کی کتاب "ظالم جادوگر اور کانا جن" پڑھ کر سنا رہا تھا۔ شمع بھی بڑے انہماک سے کہانی سن رہی تھی۔ جیسے ظالم جادوگر اور کانے جن کے کارنامے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو۔

اچانک بجلی چلی گئی اور کمرے میں ایک ہولناک اندھیرا چھا گیا۔ شمع کے منہ سے بے اختیار ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔وہ سرک کر بھائی کے اور زیادہ قریب ہو گئی۔

"یہ کم بخت بجلی والے بہت تنگ کرنے لگے ہیں۔" تنویر کو غصہ آگیا تھا۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھی۔ چارپائی سے اٹھا اور اندھیرے میں ٹٹول کر باورچی خانے سے لالٹین اٹھا لایا۔ اس نے دو ایک بار ماچس کی تیلی جلانے کی کوشش کی مگر ہوا کے جھونکوں نے اسے بجھا دیا۔ تیسری مرتبہ جب اس نے تیلی کی تلاش میں انگلیاں ڈبیہ میں ڈالیں تو وہ خالی ڈبیہ میں گھوم پھر کر واپس آگئیں۔

"لو ماچس بھی ختم ہو گئی"۔ اس نے خالی ڈبیہ کو زمین پر پٹختے ہوئے کہا۔ "اب لالٹین کیسے جلائیں؟" اس نے گویا خود سے سوال کیا۔ لیکن اس کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ گھپ اندھیرے میں شمع کی خوفزدہ سی آواز سرسرائی۔

"بھیا! مجھے ڈر لگ رہا ہے!"

"ہٹ پگلی! ڈرنے کی کیا بات ہے، ابھی لائٹ آجائے گی" اس نے گویا تسلی دی اور اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔ لیکن اندر سے اس کا دل بھی ڈر رہا تھا۔

شمع نے اس کے بازو کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اندھیرے میں تصوراتی تصویریں اسے ظالم جادوگر اور کانے جن کے ہیولے بن بن کر ڈرا رہی تھیں۔ وہ خوف سے آنکھیں بند کر لیتی مگر یہ مناظر تو بند آنکھوں کے پیچھے بھی نظر آرہے تھے۔ ماحول پر ایک پراسرار سی خاموشی طاری تھی...... اس نے رو دینے والے لہجے میں تنویر کو پکارا۔

"بھیا!"

"ہوں"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے"

"تو میں کیا کروں گڑیا مجھے بتاؤ؟" اس نے بے بسی سے کہا۔

"روشنی کرو ناں!" شمع نے کہا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ ماچس ختم ہو چکی ہے...... تنویر نے محسوس کیا کہ اب شمع کا جسم بُری طرح کپکپا رہا تھا۔ اگر لائٹ تھوڑی دیر اور نہ آئی تو یہ باقاعدہ رونا اور چلّانا شروع کر دے گی۔ آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ بولا۔

"اچھا تم ٹھہرو! میں سامنے والی خالہ کے ہاں سے ماچس لاتا ہوں!" لیکن شمع اندھیرے گھر میں

اکیلے ٹھہرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ تنویر نے اسے بھی ساتھ لیا اور سامنے والی خالہ کے دروازے پر دستک دی۔ بار بار دروازہ پیٹنے کے باوجود کوئی جواب نہ آیا۔ لگتا تھا کہ سب گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں۔ ان کے برابر والے گھر میں کوشش کی گئی مگر اس اندھیری اور سرد رات میں کون لحاف سے نکلتا...... تنویر اور شمع دونوں کے دانت بجنے لگے تھے۔ تنویر نے اسے بہلا پھسلا کر واپس گھر بھیج دیا اور خود گلی کی نکڑ والے مکان کی کھڑکی سے آتی ہوئی مدہم روشنی دیکھ کر اُدھر چلا کہ شاید وہ لوگ ابھی جاگ رہے ہوں۔

شمع ڈرتے ڈرتے گھر کے دروازے تک پہنچی۔ وہ بار بار مڑ کر دور جاتے ہوئے تنویر کو دیکھتی جاتی تھی۔ اس نے دبی آواز میں رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختی۔ کھلے دروازے سے اس نے اندر جھانکا۔ سامنے ہی پھولوں کی کیاری تھی، جس میں شمع نے اپنی پسند سے گلاب کے پودے لگائے تھے۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ ان پودوں کو پانی دینے اور کیاری کی صفائی کرنے میں وقت گزارتی تھی۔ لیکن میلی میلی چاندنی میں ہوا سے ہلتے ہوئے وہ پودے اس وقت عجیب وغریب شکلیں بنا رہے تھے۔ پودوں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی سفید دیوار پر ان کے متحرک سایوں سے سفیدی چھوٹی بڑی ہوتی تو یوں لگتا جیسے کانا جن اپنی واحد آنکھ کھول بند کر رہا ہو۔ سردی کے باوجود شمع کو پسینہ آگیا۔ اس نے کیاری کی طرف سے منہ موڑا اور آنکھیں نیم وا کر کے کمرے کی طرف دوڑ لگادی۔

دروازے کو اندر سے بند کر کے اس نے چٹخنی چڑھا دی۔ اب اپنے تئیں وہ محفوظ تھی...... لیکن اندر کا خوف...... وہ تو کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے زیادہ محفوظ ہونے کی نیت سے لحاف میں گھس جانا بہتر سمجھا۔ اس کا بدن ابھی تک کانپ رہا تھا۔ حالانکہ اس نے خود کو اچھی طرح چاروں طرف سے لپیٹ رکھا تھا اور منہ بھی اندر کر لیا تھا۔ لیکن اس کے کان ہر ہلکی سے ہلکی آہٹ کو بھی سن لیتے تھے۔ باہر چلتی ہوئی ہوا کی وجہ سے خشک پتے فرش پر سرکتے تو اسے یوں لگتا جیسے کوئی دبے پاؤں اس کے کمرے کی طرف آ رہا ہو۔ پھر اچانک نجانے کہاں سے دو بلیاں لڑتی ہوئی آئیں۔ ان کی چیخ وپکار اور بھاگ دوڑ کی وجہ سے ٹین کی چادروں والی چھت اتنے زور سے کھڑکھڑائی کہ شمع کی تو جان ہی نکل گئی۔ وہ سمجھی کہ جن چھت کے راستے اندر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ بر آمد ہوئی۔

"امی، امی۔" اس نے ماں کو بار بار مدد کے لئے پکارا اور خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی۔

دوسری طرف تنویر نے اس مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو تھوڑی دیر کے بعد ایک بزرگ ہاتھ میں تسبیح تھامے بر آمد ہوئے۔ یہ حاجی صاحب تھے۔ کئی بار حج کر چکے تھے۔ وہ شاید نماز پڑھ رہے تھے۔ آتے ہی تیزی سے بولے۔

"کیا بات ہے؟"

تنویر اس لب ولہجے سے گھبرا گیا۔ ہکلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ جی...... وہ دراصل جی...... میری امّی ابّو......"

"جلدی بتاؤ۔ نماز چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"دراصل وہ میلاد میں گئے ہیں...... بتی چلی گئی ہے ناں، تو ....

میری چھوٹی بہن اندھیرے میں ڈر رہی ہے...... وہ میں ماچس لینے آیا تھا آپ سے"......

تنویر نے اٹکتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔

"دیکھو میاں صاحب زادے۔ میری بیوی بھی پڑوس میں گئی ہوئی ہیں اور پتہ نہیں ماچس کہاں رکھی ہوئی ہے۔ تم کہیں اور سے مانگ لو میری نماز نکلی جارہی ہے۔"

"اتنا کہہ کر انہوں نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ تنویر کو بہت غصہ آیا۔ جی میں آیا کہ ایک پتھر اٹھا کر دروازے میں مارے اور بھاگ جائے مگر امی کی بات کا خیال آگیا...... وہ کہا کرتی تھیں کہ کسی کی برائی کے بدلے میں برائی نہیں کرنی چاہئے۔

"کنجوس مکھی چوس" اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے ذرا بلند آواز میں کہا اور ہوا میں مکاّ لہرایا۔

اسے سخت سردی لگ رہی تھی۔ اس کے علاوہ اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ شمع اس کے انتظار میں خوف سے مری جارہی ہوگی۔ لیکن وہ ماچس کے بغیر واپس کیسے جاتا۔ محلے کا واحد کریانہ اسٹور آٹھ بجے ہی بند ہو جاتا تھا۔ وہ سوچتا ہوا گلی سے باہر نکل آیا۔ سڑک پر پہنچ کر اسے اچانک خیال آیا کہ دو تین گلیاں چھوڑ کر اس کے دوست افتخار کا گھر بھی تو ہے ایک گلی میں۔

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔" وہ بڑبڑایا، "افتخار کے ابّو ڈاکٹر ہیں وہ دیر سے گھر آتے ہیں۔ ابھی تو وہ لوگ جاگ رہے ہوں گے۔" اس نے سوچا کہ اگر وہ ذرا جوگنگ کرتا ہوا جائے تو ایک تو جلد پہنچ جائے گا اور دوسرے سردی بھی ذرا کم لگے گی۔ وہ آہستہ آہستہ دوڑنے لگا۔ اسے دوڑتا ہوا دیکھ کر کسی دکان کے تھڑے کے نیچے بیٹھا ہوا کتّا ایک دم بھونکتا ہوا نکلا اور اس کے پیچھے ہولیا۔ کتّے کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر تنویر کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ چیختا ہوا اور تیز دوڑنے لگا۔ مگر افتخار کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی کتّے نے اسے آلیا اور اس کی ٹانگ پکڑ کر بھنبھوڑ ڈالی...... تنویر کی چیخیں سن کر گلی کے بہت سے دروازے کھلے اور لوگ باہر نکل آئے...... اتنے بہت سے آدمیوں کو دیکھ کر کتّا ڈر کے بھاگ گیا۔ تنویر ابھی تک زمین پر پڑا کراہ رہا تھا...... افتخار بھی اپنے ابّو کے ساتھ ہی گھر سے نکل آیا تھا۔ اس نے جب تنویر کو دیکھا تو فوراً اس کی طرف لپکا...... پھر افتخار کے ابّو نے ایک دو اور لوگوں کے ساتھ مل کر اسے اٹھایا اور اپنے گھر لے گئے۔ ابتدائی طبّی امداد دینے اور زخم پر پٹی وغیرہ باندھنے کے بعد تنویر کو گھر چھوڑنے کے لئے

انہوں نے اپنی کار نکالی۔

گھر پر تنویر کے امّی ابّو آ چکے تھے۔ شمع بستر میں لیٹی کراہ رہی تھی اسے بہت تیز بخار تھا۔ امّی اس کے سرہانے بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھیں۔ افتخار کے ابو نے اسے بھی دوا دی۔ تنویر کے ابّو نے بتایا کہ جب وہ لوگ گھر پہنچے تو بجلی آ چکی تھی۔ باہر گلی کا دروازہ کھلا تھا لیکن کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کئی بار کھٹکھٹانے اور آوازیں دینے کے باوجود جب کوئی جواب نہ آیا تو وہ کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوئے۔ شمع بستر پر بے ہوش پڑی تھی ...... افتخار کے ابّو نے تنویر کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بتایا تو تنویر کی امّی بولیں۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا، اگر میں میلاد کے بعد فریدہ کا نیا زیور دیکھنے کے لئے نہ رکتی تو ایسا نہ ہوتا۔ انہوں نے تاسف سے کہا اور "میرا چاند" کہتے ہوئے پیار سے شمع کا ماتھا چوم لیا۔

لیکن میرا خیال ذرا مختلف ہے" تنویر کے ابّو بولے ...... "میں نے کئی بار تنویر کو منع کیا تھا کہ یہ بکواس قسم کی کہانیاں نہ پڑھا کرو...... جن، بھوت، پریاں...... ہونہہ، بوگس" انہوں نے نفرت سے ناک سکیڑتے ہوئے کہا"

"یہ سوائے بچّوں کے دل میں خوف پیدا کرنے کے اور کیا کرتی ہیں" انہوں نے افتخار کے ابّو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ افتخار کے ابّو نے اثبات میں گردن ہلائی پھر کہنے لگے۔

"کسی حد تک تو آپ دونوں کی باتیں درست ہیں لیکن میرے خیال میں اصل قصور حاجی صاحب کا ہے"

"لو یہ حاجی صاحب بے چارے بیچ میں کہاں سے آ گئے" تنویر کی امّی بولیں۔

"آپ میری بات مانیں۔ اصل قصور انہی کا ہے" ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ تو تنویر کے ابّو نے پوچھا۔

"لیکن کیسے؟"

"وہ ایسے کہ اگر وہ تنویر کے مانگنے پر ماچس کی ڈبیہ دے دیتے تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ حاجی صاحب کے نامناسب رویئے ہی کی وجہ سے دونوں بچوں کو تکلیف اٹھانی پڑی۔

وہ ذرا دیر کے لئے چپ ہوئے پھر بولے۔

"اسی لئے تو اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ

"ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ جو دکھاوا کرتے ہیں اور عام استعمال کی چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگے سے ایک دوسرے کو نہیں دیتے۔"

تنویر کے امّی ابّو نے یوں گردن ہلائی جیسے انہیں ڈاکٹر صاحب کی بات سے مکمل اتفاق ہو۔

مہم جوئی کی رونگٹے کھڑے کردینے والی سچّی داستان

میں نے تنِ تنہا ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سر کی

رینہو ہولڈ میسنز
ترجمہ: ارشد شاہین

صبح کی چمکتی دھوپ میں ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی صاف نظر آرہی تھی۔ اس چوٹی کی بلندی ۲۹ ہزار ۲۸ فٹ ہے اور تبّت والے اسے، کومولانگما، یعنی دنیا کی ماں دیوی کہتے ہیں میں اس کے مختلف نوکیلے سروں اور پہاڑیوں کے سلسلوں میں سے ہر ایک کو صاف پہچان رہا تھا۔ سب سے نمایاں چوٹیوں کا شمال مشرقی سلسلہ تھا جہاں برطانوی کوہ پیما جارج میلوری اور اینڈیو اروِن کو آخری مرتبہ دیکھا گیا تھا۔ انہوں نے ۱۹۲۴ء میں چوٹی کو سر کرنے کی کوشش کی تھی اور اس دوران گم ہوگئے تھے اور پھر ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا اور اب میں انہی کے نقش قدم پر چل کر تبت کی جانب سے ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دو سال پہلے ۱۹۷۸ء میں بھی میں آسٹریا کے کوہ پیماؤں کی ایک مہم جُو جماعت کے ساتھ یہ عظیم چوٹی سر کر چکا تھا۔

اس دفعہ ہم لوگ نیپال کی طرف سے گئے تھے۔ ہمارے ساتھ اور بہت سے ساتھی اور ملازم بھی تھے۔

مگر اس بار .... اس بار نہ تو کوئی قلی تھے اور نہ ہی کوئی ساتھی کوہ پیما۔ نہ مصنوعی آکسیجن کا انتظام اور نہ کوئی ریڈیو۔ میں اپنی کوہ پیمائی کی زندگی کے سب سے بڑے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے دنیا کے سب سے بڑے پہاڑ کو تن تنہا سر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

۱۹۸۰ء جولائی کے وسط میں میں اور نینا ہولگوین تبت سے ہوتے ہوئے ۲۱ ہزار ۳۲۵ فٹ کی بلندی پر پہنچے اور اپنا بلندی کا بیس کیمپ قائم کر دیا۔ نینا کینڈا کی مشہور صحافی اور کوہ پیما تھیں۔

۱۸ اگست کو صبح ۵ بجے منہ اندھیرے اپنے کیمپ سے میں اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی مہم پر روانہ ہوا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں ایک مصیبت میں پھنس چکا تھا۔

ہوا یہ کہ میں ایک بہت بڑی برفانی دراڑ کے اوپر برف کے بنے ہوئے ایک قدرتی پل سے گذر رہا تھا کہ یکایک یہ پل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بیٹھ گیا۔ اور میں گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔ اور جب میں شگاف کی دیواروں پر کبھی دائیں اور کبھی بائیں ٹکراتا ہوا نیچے کی طرف جارہا تھا تو مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی سلو موشن فلم چل رہی ہو۔ اور پھر اچانک میں رک گیا۔ میرے ارد گرد سخت اندھیرا تھا۔ اف میرے خدا...... شاید اب میں اس گہرائی میں ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاؤں گا۔

میں نے ایک سوراخ میں سے اوپر جھانکا۔ آسمان پر ستارے جھلملاتے نظر آرہے تھے۔ میں نے اپنے ہیڈ لیمپ کی مدد سے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ برف کی دیوار پر سے منعکس ہو کر ہیڈ لیمپ کی روشنی نیلاہٹ مائل سبز روشنی دے رہی تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے ارد گرد کی دیواریں چھ چھ فٹ دور تھیں اور جس پلیٹ فارم نے مجھے تھام رکھا تھا وہ ایک مربع گز سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔

میں نے نیچے کی تاریک اور خالی جگہ کو روشن کرنے کی کوشش کی۔ خدا کی پناہ! اس کی کوئی حد نظر نہیں آتی تھی۔ اگر میرے قدموں کے نیچے کا پلیٹ فارم میرے بوجھ سے بیٹھ جاتا تو میں بے حد گہرے غار میں جا پڑتا ...... جس میں سے میں کبھی نکل نہ سکتا تھا۔ ایک اذیت ناک سرد موت مجھے کسی بھی وقت اپنے ٹھنڈے جبڑوں میں لے سکتی تھی۔ اور میرا حشر اور میری داستان بھی مجھ سے پہلے جانے والے مہم جوؤں سے مختلف نہ ہوتی۔ میری گم شدگی کا اعلان کر دیا جاتا اور میں اس سرد قبر میں پڑا ہوتا۔ ایک ایسی قبر جس کا کسی کو بھی علم نہ ہوتا۔ خیالات کے ایک ریلے نے میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑا دی۔ اور پھر میری زندہ رہنے کی خواہش اور صلاحیتیں جاگ اٹھیں۔ میں نے دیکھا کہ دیوار کے ساتھ ساتھ برف کا ایک پشتہ سا اوپر تک جارہا

تھا۔ میں نے اس کے سہارے سہارے اوپر چڑھنا شروع کر دیا میرے ایک ہاتھ میں برف کھودنے کی کدال اور دوسرے میں برف پر پھسلنے والوں کی چھڑی تھی۔ میں اپنے آپ کو متوازن رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہوئے قدم قدم اوپر چڑھتا رہا یہ ایک بے حد مشکل کام تھا لیکن یہی کام مجھے زندگی کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں چڑھتا رہا حتیٰ کہ میں اس غار کے دہانے تک پہنچ گیا۔

غار کے منہ کے ساتھ برف کی بالکل عمودی دیوار بن گئی تھی۔ میں نے اپنی اسکائنگ کی چھڑیاں زیادہ سے زیادہ برف کے اندر گھساتے اور پھر ان کی مدد سے جھولتے ہوئے اوپر چڑھنا شروع کیا اور اپنی روانگی کے صرف دو گھنٹے بعد میں نارتھ کول پر کھڑا تھا جو ۲۲ ہزار ۹۳۰ فٹ بلند پہاڑی ہے۔ پھر میں اور آگے بڑھتا رہا۔

صبح ۹ بجے میں نے بلندی ناپنے کے اپنے آلے پر دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں ۲۴ ہزار ۷۱۴ فٹ کی بلندی پر پہنچ چکا ہوں۔ پھر جب میں برف کے ٹکڑوں اور ٹیلوں پر سے ہوتا ہوا شمالی چوٹی کی ڈھلان سے اوپر چڑھ رہا تھا تو برف میرے سر کے ارد گرد چکر لگا رہی تھی۔ سخت اور تیز ہوا کے تھپڑوں نے میری توانائی ختم کرنا شروع کر دی۔ ۲۴ ہزار ۶۰۰ فٹ کی بلندی تک پہنچتے پہنچتے میں بُری طرح کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ میں نے خود سے کہا "مجھے تھکنا نہیں چاہئے۔ اگلے دو دن تو اور زیادہ سخت محنت کے ہیں!"

میں اکیلا مہم جُو تھا۔ میری رفتار بہت کم تھی۔ بس یوں سمجھیں کہ میں ایک گھونگھے کی طرح رینگ رہا تھا میرا "گھر" یعنی میرا سازو سامان میری کمر پر تھا۔ میں آہستہ آہستہ مگر مستقل مزاجی سے اوپر چڑھتا رہا۔ نہ میرا وائرلیس پر کسی سے کوئی رابطہ تھا۔ نہ مجھے پیچھے سے سامان ملنے کی کوئی امید تھی، نہ ہی ہر آنے والی بلندی پر نیا کیمپ قائم کیا جا رہا تھا جیسا کہ ایسی مہمات میں ہوتا ہے، نہ میری ٹیم میں کوئی ایسے افراد تھکن سے آزاد رکھے گئے تھے کہ آخری مرحلے میں وہ آگے جائیں۔

اگر مصنوعی آکسیجن ساتھ ہوتی تو اس سے ہی کچھ مدد ملتی لیکن اس کا سازو سامان اس قسم کی کھڑی چڑھائی کے لئے بہت بھاری ہوتا اور ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہوتا۔ آکسیجن ساتھ نہ لینے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ میں اصل میں اس بلندی کی آب و ہوا کو اس کی اصل شکل میں جاننا چاہتا تھا۔ اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ خود میرا جسم اور میرا دماغ اس قدرتی ماحول کی طاقتوں سے کسی طرح مقابلہ کرتے ہیں۔ ان حالات میں اگر مصنوعی آکسیجن کا سلنڈر میرے ساتھ ہوتا تو میں کسی کھڑی چڑھائی والی اتنی سی پہاڑی بھی سر نہ کر سکتا جو میرے قد کے برابر اونچی ہوتی۔ میں چاہتا کہ اس کی چوٹی خود ہی مجھ تک آ جائے۔

میں اپنے کمر کے تھیلے کے وزن کو ہی اتنا زیادہ وزنی محسوس کر رہا تھا کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اس تھیلے میں خیمہ، بستر بند، چولہا، ایندھن، خوراک اور کوہ پیمائی کے آلات تھے۔

اب مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہونا شروع ہوئی۔ میں تھوڑا ہی چل پاتا تھا کہ آرام کرنے

کو رکنا پڑتا تھا۔ اگر میں بیٹھ جاتا تو پھر دوبارہ اٹھنا تقریباً ناممکن محسوس ہوتا۔ پھر بھی جیسے تیسے میں چلتا رہا۔

ایک ایک قدم بڑھاتے اور بلندی پر چڑھتے ہوئے میں ۲۵ ہزار ۵۹۰ فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا اور ایک مناسب جگہ دیکھ کر اپنا خیمہ گاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ہوا بہت تیز تھی۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ آخر میں خیمہ کھڑا کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ میں نے زمین پر پولیتھین کا فرش بچھایا اور رینگ کر اندر داخل ہو گیا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا "بھئی اب کچھ پکانا شروع کرو"۔ مجھے روزانہ کم از کم چار گلاس پانی پینا چاہئے تھا۔ میں نے گیس کے چولہے پر کچھ برف پگھلا کر پانی بنایا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس بلند مقام پر صرف ایک گلاس پانی حاصل کرنے کے لئے مجھے کس قدر محنت اور وقت اور برف خرچ کرنا پڑی۔ مجھے برتن میں بار بار برف ڈالنا پڑتی میں نے پانی کے گلاس میں خشک ٹماٹو کیچپ کا پاؤڈر حل کیا۔ ان کے دو گلاسوں سے میں نے نمک والی تبتی چائے بنائی۔

کھانا پکانا ختم ہوا تو میں سلیپنگ بیگ میں گھس گیا اور اونگھنے لگا۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ صبح ہے یا شام۔ میں ڈر گیا۔ میرے ۳۰ سال کی کوہ پیمائی کے احساسات بیدار ہو رہے تھے۔ تھکن، کھو جانا، برف کے طوفان، اور ایسے ہی خیالات کے اژدہام نے مجھے ڈرا دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ کونسی چیز مجھے کامیاب کر سکتی ہے یعنی قوت اور ہمت جمع رکھنا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ایورسٹ کی چوٹی کے بالکل نیچے کی چڑھائی کسی قدر مشکل اور پر مشقت ہوگی۔ ایک ایسے وقت میں جب وہ نہایت قریب تھی اور پھر بھی بہت دور تھی۔ امید بھی بندھتی تھی اور مایوسی بھی منہ چڑاتی تھی۔

اگلی صبح سورج کی روپہلی کرنوں نے ماحول کو منور کیا اور میرے خیمے سے ٹکرائیں تو میں نے تازہ، صاف اور جاں فزا ہوا میں خود کو بہت تازہ دم محسوس کیا۔ لیکن یہ خوشگواری زیادہ دیر قائم نہیں رہی کیونکہ گھنٹہ بھر بعد ہی مَیں گھٹنوں گھٹنوں برف میں چلتے ہوئے پہاڑیوں کے شمالی سلسلے کی عمودی ڈھلان پر چڑھ رہا تھا۔

اگر مجھے ایسی گہری برف پر سے ہی ہو کر چڑھائی جاری رکھنی پڑتی تو میں اپنی کوشش ترک کرنے پر تیار ہو جاتا لیکن جلد ہی میں نے ایک متبادل راستہ تلاش کر لیا۔ ایک راستہ میرے دائیں ہاتھ سے ہو کر جاتا تھا۔ اس کی ایک جانب بہت سے برفانی تودے گرے تھے۔ میرا خیال تھا کہ تازہ برف ان کے ساتھ لڑھک گئی ہوگی اور سخت سطح نکل آئی ہوگی جو چلنے کے لئے مناسب تھی۔ یہ اب واحد راستہ تھا جو میرے پاس تھا۔ میں آہستہ آہستہ چڑھتا گیا۔ ہر ہر قدم پر سوچنا پڑتا۔ بعض اوقات میرے قدم ایسی برف پر پڑتے جو اوپر سے چھلکے کی طرح سخت اور نیچے نرم ہوتی اور یہ بھی ہوتا کہ میرے بوٹ سخت اور چکنی سطح پر پھسلتے پھسلتے مشکل سے ہی

بچتے اور اس جدوجہد میں میں دھیان ہی نہ کر سکا کہ موسم کس قدر خراب ہو رہا تھا۔

چار بجے تک میں بہت بُری طرح تھک چکا تھا میں نے کوشش کر کے برف کی ایک چٹان پر اپنا خیمہ کھڑا کر لیا۔ جب میں خیمے میں لیٹا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے بوٹوں کے اندر میرے پیر پسینے کی وجہ سے گیلے تھے اگر انہیں خشک کرنے کے لئے جوتے اتارتا تو پیر برف کی طرح منجمد ہو جاتے۔ میں نے ایسی غلطی کی ہمت نہیں کی۔

"اگر نیچے کی وادی سے اٹھنے والی دھند کل صبح تک صاف نہ ہوئی تو؟...... میں نے سوچا۔ "کیا مجھے انتظار کرنا چاہئے؟ نہیں! ہر گز نہیں۔ یہ تو کہیں کی عقلمندی نہیں ہوگی اتنی زیادہ بلندی پر کوئی بھی ضمانت نہیں دے سکتا کہ دھند صاف ہو جائے گی اور کل کا دن گذر گیا تو پرسوں تک میں اتنا کمزور ہو جاؤں گا کہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکوں گا۔

"کل یا تو مجھے اوپر چڑھنا ہے یا پھر واپس لوٹ جانا ہے۔" ۲۰ اگست کی صبح کو موسم صاف تھا لیکن بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے جوتوں کے تسمے اور کس کے باندھ لئے۔ اپنا کیمرہ کندھے پر لٹکایا اور برفانی تیشہ اپنے ایک ہاتھ میں تھام لیا باقی ہر چیز میں نے خیمے میں ہی چھوڑ دی۔

آگے کی چڑھائی اگرچہ جسمانی طور پر سخت تھکا دینے والی تھی لیکن تیکنیکی طور پر زیادہ مشکل نہیں تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد نرم برف کی وجہ سے میری رفتار کم ہو گئی۔ میں ہاتھوں اور ٹانگوں کے بل کسی چوپائے کی طرح رینگ کر آگے بڑھنے لگا۔ بہت سستی اور کاہلی سے۔ اب میں چوٹی کے بالکل نیچے کھڑا تھا۔ دھند بے حد گہری تھی اور میں بمشکل اپنے آپ کو کھڑا کر پا رہا تھا۔ میرے حواس بھی مکمل طور پر بحال نہ تھے نیم بے ہوشی کے عالم میں اگلے تین گھنٹے میں اوپر چڑھتا رہا۔

اچانک مجھے المونیم کی ایک تپائی نظر آئی جو اس بات کا ثبوت اور نشانی تھی کہ انسان زمین کی سب سے بلند جگہ کو فتح کر چکا تھا۔ تپائی کا کچھ حصہ برف سے اوپر نکلا ہوا تھا۔ چین کے کوہ پیماؤں نے یہ تپائی ۱۹۷۵ء میں اس بلند ترین مقام پر نصب کی تھی۔

میں ایک پتھر کی طرح وہاں بیٹھا تھا۔ میں نے وہاں پہنچے کے لئے اپنی توانائی کا ہر ہر ذرہ صرف کر دیا تھا۔ میں کسی بھی احساس سے عاری تھا۔ بادلوں میں سے تھوڑا تھوڑا آسمان نظر آ رہا تھا۔ جیسے مجھے چپکے چپکے مبارکباد دے رہا ہو۔ اور پھر اچانک بادل اکٹھے ہو گئے اور چاروں طرف گھومنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پوری زمین تھرتھرا رہی ہو۔

دوسری بار میں دنیا کے سب سے بلند مقام پر پہنچا تھا اور اس دفعہ بھی میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دیر میں وہاں یونہی بیٹھا رہا۔ اور پھر آہستگی سے اٹھا اور نیچے اترنا شروع کیا۔

ساڑھے تین گھنٹے بعد میں اپنے کھلے کیمپ میں تھا۔ میں نے پانی تو پگھلا لیا لیکن مجھ میں سُوپ بنانے کی

سکت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ میں وہ پانی بھی نہ پی سکا۔ نہ تو رات بھر میں سو سکا اور نہ ہی میں پوری طرح ہوش میں تھا۔

اگلے دن میں بیدار ہوا اور پھر اترنا شروع کر دیا۔ جب میں نارتھ کول کی چوٹی تک پہنچا تو میرے ہوش حواس ٹھکانے نہیں تھے۔ نینا نے بتایا کہ پہاڑ سے اترتے ہوئے میں ایک ایسا آدمی لگ رہا تھا جو نشے میں دُھت لڑھکتا چلا آرہا ہو۔

کیمپ پہنچ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ خوشی کے آنسو۔۔۔ ان آنسوؤں سے طبیعت میں بڑا انشاط اور سکون پیدا ہوا۔ خوشی تھی کہ بحفاظت واپس اپنے کیمپ میں پہنچ گیا ہوں۔ خیمے میں لیٹتے ہی میرا جسم بخار سے پُھنکنے لگا۔ نینا میرے ماتھے پر برف کی پٹیاں بدلتی رہی اور فروٹ جُوس کے ڈبے کھول کھول کر میرے منہ میں ایک کے بعد ایک ڈالتی رہی تاکہ میرا سارا جسمانی نظام جو خشک ہو چکا تھا اپنا کام دوبارہ شروع کر دے۔

کچھ دیر بعد میرے حواس بحال ہونا شروع ہوئے۔ میں نے نینا کو تمام حالات و واقعات بتانا شروع کئے۔ نینا نے مجھ سے کہا "اس بار ۲۹ ہزار فٹ بلند پہاڑ پر ایک بار پھر اکیلے جاؤ" میں جواب میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ میں ایسی صورتحال کا ایک بار پھر مقابلہ کر سکتا ہوں۔ بس اب اور ہمت نہیں ہے۔"

جانور آپ کی محبت کے مستحق ہیں

جانور بے زبان ہوتا ہے اس لیے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کر سکتا۔ مگر جانور آپ کے پیار کو محسوس کر کے آپ کا مطیع ضرور بن سکتا ہے

جانور اگر درندہ نہیں تو اُس سے محبت کیجیے اُس کا خیال رکھیے

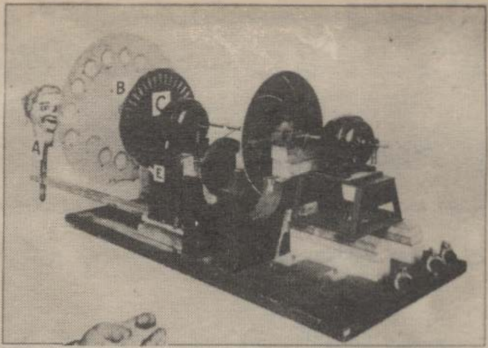

قصّہ ایک موجد کا

شاہد محمود عابد

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائیگی

دنیا کی پیدائش قدرت کا کرشمہ ہے اور اہل دنیا کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے علم سائنس کے ذریعے مختلف ایجادات منظر عام پر آئی ہیں وہ سائنس کے کرشمے ہیں۔

اپنے ارد گرد نگاہیں دوڑائیے ! آپ کو ایسی ہزاروں چیزیں دیکھنے کو ملیں گی جو باعث حیرت بھی ہیں اور مفید بھی ان میں ایک چیز ٹیلی ویژن ہے۔ جو ۱۹۲۶ء کو ایک عام اور سادہ بن کر ابھرا اور آج ہزاروں رنگ بدل کر جدید سے جدید تر بن گیا۔

ٹیلی ویژن دو لفظوں ٹیلی ( ) یعنی دور اور ویژن ( ) یعنی نظارہ سے مل کر بنا ہے۔ اس کا مکمل مطلب ہے دور کا نظارہ

بیسویں صدی کی جہاں دوسری حیرت انگیز چیز تھیں انہیں میں ٹیلی ویژن بھی سائنس کا بہت بڑا معجزہ ہے۔ جس کے ذریعے ہم ہزاروں میل دور بیٹھے لوگوں کو کھیلتے کودتے، باتیں کرتے اور ناچتے گاتے دیکھ سکتے ہیں۔

ٹیلی ویژن کی ایجاد کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔

آج سے تقریباً ۶۰ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ سکاٹ لینڈ کا ایک شخص جان لوگی بیرڈ

سخت بیمار پڑ گیا۔ وہ بیمار تو اکثر رہا ہی کرتا تھا مگر اس دفعہ اس کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے جب دیکھا کہ کوئی دوا وغیرہ تو اثر کر نہیں رہی تو ان کے ذہن میں ایک اور خیال آیا "شاید بیرڈ کو یہاں کی آب و ہوا راس نہ آ رہی ہو!!!"

چنانچہ انہوں نے یہ آخری داؤ بھی آزمانے کا فیصلہ کر لیا اور اسے ایسی جگہ جانے کا مشورہ دیا جہاں ٹھنڈ زیادہ نہ ہو۔ بیرڈ نے فوراً اس مشورے پر عمل کیا اور سکاٹ لینڈ سے انگلینڈ آ گیا۔ اور ایک ساحلی شہر ہیسٹنگز میں رہنے لگا۔ ڈاکٹروں کا خیال درست نکلا اور وہ دن بدن صحت مند ہونے لگا۔

بیرڈ کو سائنس سے لگاؤ تھا۔ ہر وقت تجربات کرتے رہنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ خاص طور پر فوٹو گرافی اور ٹیلی فون پر زیادہ تجربات کرتا رہتا تھا۔

ایک شام بیرڈ کھانا کھانے کے بعد ٹہلنے کی غرض سے ساحل سمندر پر آ گیا۔ شفق پر زردی پانی میں اپنا عکس ڈال کر بڑا دلفریب نظارہ پیش کر رہی تھی۔ وہ اس خوبصورت منظر میں کھویا ہوا تھا کہ دفعتاً اس کے کانوں سے گانوں کی آواز ٹکرائی۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا تو پتا چلا کہ پاس ہی ایک ہوٹل میں ریڈیو بج رہا ہے۔ بیرڈ ایک ذہین آدمی تھا۔ وہ ہر چھوٹے سے چھوٹے نقطے پر سوچنے کا عادی تھا۔

اس نے سوچا کہ ہوا کی لہروں پر آواز کتنی دور تک چلی جاتی ہے کیا ایسا ممکن ہے کہ ان لہروں پر تصویر ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکے؟

اس نے صندوق، کپڑا سینے کی چند سوئیاں، سائیکل کے لیمپ کا شیشہ، بسکٹوں کے خالی ڈبے، کچھ بیٹریاں بجلی کے تار اور بہت سا موم اکٹھا کیا۔ اس کے بعد بجلی سے چلنے والی ایک موٹر خریدی اور یہ تمام سامان لے کر ایک کمرے میں بند ہو گیا۔

وہ ڈاکٹروں کی ہدایتیں بھول کر ایک نئے تجربے میں گم ہو گیا اس کے دن اور رات اسی کمرے میں گزرتے۔ وہ فطرتاً ایک محنتی انسان بھی تھا۔ وہ بس مسئلے کو لے کر بیٹھتا اسے حل کر کے ہی چھوڑتا تھا۔ اور اس تجربے میں اپنی اس عادت کو اس نے کچھ زیادہ ہی رنگ دے دیا۔

ایک لمبے اور تھکا دینے والے عرصے تک وہ، دن رات ایک کر کے اسی کمرے میں تجربات کرتا رہا۔ اس نے دوسرے کمرے میں ایک پردہ لگا رکھا تھا۔ وہ اس پردے پر تصویر لانا چاہتا تھا۔ آخر ایک دن اس کی محنت رنگ لائی۔ پردے پر تصویر آ گئی مگر وہ کچھ زیادہ صاف نہ تھی۔ لیکن بیرڈ کے لئے یہی کافی تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی ہو چکی تھی۔ اور اس کامیابی کی وجہ سے وہ پہلے سے زیادہ مستعد

ہو کر کام کرنے لگا۔

اسے ایک ترکیب سُوجھی، اس نے زیادہ روشنی استعمال کرنے کی سوچی۔ اس لئے وہ ایک ہزار بیٹریاں خرید کر دوبارہ تجربات میں جُت گیا۔ لیکن اس دوران اسے مالک مکان نے نکال دیا۔ وہ اس شہر سے بد دل ہو گیا اور لندن آگیا۔ یہاں اس نے ایک بڑا سا مکان کرائے پر لیا...... ایک کمرے میں سٹوڈیو بنایا اور دوسرے کمرے ٹی وی سیٹ رکھا۔ اس نے سٹوڈیو والے کمرے میں ایک گڑیا کو رکھا اور تیز روشنی استعمال کی۔ سکرین پر نمایاں تصویر دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی وہ خوشی سے ناچنے لگا۔ یہ ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے۔

اگلے دن اس نے اپنا یہ کارنامہ کئی سائنس دانوں کو دکھایا۔ یہ سائنس دان بھی اس کے ہم خیال تھے بیرڈ کی کامیابی دیکھ کر انہوں نے کہا "بیرڈ تم نہیں جانتے! یہ کتنی بڑی کامیابی ہے۔ تم نے میدان مار لیا ہے" برطانیہ کے اخباروں نے اس کی اور اس کی حیرت انگیز ایجاد کی رنگین تصاویر چھاپیں اور اس ایجاد کا حال شہ سرخیوں کے ساتھ چھاپا۔ دنیا بھر میں اس کی دھوم مچ گئی وہ شہرت اور ناموری کی آخری سیڑھی پر قدم رکھ چکا تھا۔

اس کے بعد یعنی ۱۹۴۰ء میں بیرڈ نے رنگین ٹی وی ایجاد کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ان دنوں دوسری جنگ عظیم عروج پر تھی۔ ساری دنیا آگ کی لپیٹ میں آچکی تھی مگر بیرڈ تمام دنیا سے بے خبر اپنے مقصد کے حصول میں جتا رہا۔ اور آخر کار ایک سال کے عرصے کے بعد اسے کامیابی ہوئی۔ یہ ۱۹۴۱ء کا سال تھا۔

بعد میں ٹیلی ویژن کو مزید جدید کر دیا گیا۔ اس میں طرح طرح کے اصلاحیں کی گئیں لیکن ٹیلی ویژن ایجاد کرنے کا سہرا جان لوئی بیرڈ کے سر ہے۔

ٹیلی ویژن ایک نہایت مفید ایجاد ہے۔ یہ نہ صرف تفریح کا ذریعہ ہے بلکہ تعلیم میں بھی اضافہ کرتا ہے اسکی طرف ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھنا چاہئے۔ کیوں کہ یہ آنکھوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے اس سے تقریباً "۹ یا "۸" فٹ دور بیٹھیں بعض ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اندھیرے میں ٹیلی ویژن دیکھنے سے کینسر بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اسے روشنی میں دیکھنا چاہئے۔

جان لوئی بیرڈ تو کب کا مر چکا ہے لیکن اس کا نام شاید کبھی بھی نہ مٹ سکے رہتی دنیا تک۔ وہ ایک محنتی انسان تھا اور محنت نے اسے یہ پھل دیا کر گمنامی کی موت مرنے کی بجائے ابھی تک زندہ کئے بیٹھی ہے۔

وہی لوگ پاتے ہیں عزت زیادہ
جو دنیا میں کرتے ہیں محنت زیادہ

سب سے اچھی چیونگ گم جوجو کی یہ ببل گم
لذّت کی لذّت
کھیل کا کھیل
Bubble Gum
گلف فوڈ انڈسٹریز گوجرانوالہ (پاکستان)

سپاہی اور جن

سیّد شاہد میر

کسی ملک میں ایک بہت ذہین سپاہی رہتا تھا۔ جب اسے نوکری کرتے کرتے پچّیس سال پورے ہوئے تو وہاں کے حاکم نے اسے بلا کر کہا کہ "اب تمہاری نوکری کی مدت پوری ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔ تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔"

یہ سن کر بیچارہ سپاہی وہاں سے رخصت ہوا۔ وہ رستے میں سوچتا جا رہا تھا کہ حاکم کے پاس پچّیس سال نوکری کی۔ لیکن اس کے عوض انہوں نے مجھے پچّیس آنے بھی نہیں دیئے۔ گھر پہنچنے کے لئے صرف تین روٹیاں ملی ہیں اب کروں تو کیا کروں؟ خیر اب مجھے اپنے گھر واپس جانا چاہئے اور اپنے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرنی چاہئے۔ اگر وہ مر چکے ہیں تو ان کی قبروں پر کچھ آنسو بہا کر اپنا جی ہلکا کر لوں گا۔

سپاہی کو چلتے چلتے سہ پہر ہو گئی تھی۔ وہ دو روٹیاں کھا چکا تھا۔ باقی ایک روٹی بچ گئی تھی اور ابھی منزل دور تھی۔ راستے میں اسے ایک فقیر ملا جو نابینا اور لنگڑا تھا۔ سپاہی کے پاس جو ایک روٹی بچی ہوئی تھی۔ وہ اس

نے فقیر کو اس خیال سے دے دی کہ میں تو کسی طرح اپنا گزارا کر لوں گا مگر یہ بوڑھا لنگڑا اور نابینا فقیر کیا کرے گا۔ سپاہی نے پائپ میں تمباکو بھرا اور پیتے ہوئے پھر سفر پر روانہ ہو گیا۔

چلتے چلتے وہ ایک جھیل کے کنارے پہنچا۔ جھیل میں بطخیں تیر رہی تھی۔ سپاہی نے چپکے سے تین بطخوں کو پکڑ لیا اور کہا "یہ ہو گیا کھانے کا بندوبست۔" بطخیں اٹھا کر وہ ایک گاؤں کی طرف جانے لگا۔ وہاں سپاہی ایک سرائے میں گیا اور سرائے کے ملک کے سامنے تینوں بطخیں رکھیں اور کہا۔ "بھائی! یہ تین بطخیں ہیں۔ ایک تو میرے لئے پکاؤ۔ دوسری تمہاری محنت کی اور تیسری تمہارے کھانے پینے کے لئے ہے۔" یہ کہہ کر سپاہی نے ہاتھ منہ دھویا، کپڑے دھول میں اٹے ہوئے تھے ان کو صاف کیا۔ چارپائی پر بستر بچھا کر کھانے کے انتظار میں بیٹھ گیا تھوڑی ہی دیر کے بعد بھنی ہوئی بطخ سپاہی کے سامنے آئی جو اس نے خوب پیٹ بھر کر کھائی۔ کھانے کے بعد سپاہی نے سرائے کے ملک سے پوچھا۔ "اس راستے پر جو حویلی ہے وہ کس کی ہے؟"

سرائے کے ملک نے بتایا کہ "یہ حویلی شہر کے ایک بڑے سوداگر نے بڑی چاہ سے بنوائی تھی، مگر بے چارہ اس میں رہنے سے لاچار ہے۔"

سپاہی کو عجب لگا اور پوچھا "لیکن وہ کیوں نہیں رہ سکتا؟"

"اس حویلی میں جنوں اور بھوتوں کا میلہ لگتا ہے۔ رات ہوتے ہی حویلی میں شور و غل ہوتا ہے۔ وہ زور زور سے چیختے اور گاتے رہتے ہیں۔ رات کو تو چلو ٹھیک ہے۔ مگر دن میں بھی بیچارے اس حویلی کے نزدیک جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔" سرائے کے مالک نے بتایا۔ یہ بات سن کر سپاہی نے سرائے کے ملک سے اس سوداگر کا پتا معلوم کیا اور کہا "میں اس سے مل کر حویلی کے متعلق مزید معلومات کروں گا۔ ہو سکتا ہے میں اس کی کوئی مدد کر سکوں۔" یہ کہہ کر سپاہی آرام کی غرض سے سو گیا۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ حویلی والے سوداگر کے گھر جا پہنچا۔ سوداگر نے سپاہی کو دیکھا اور پوچھا کہ "کہو بھائی کیا بات ہے ادھر کیسے آنا ہوا؟" سپاہی نے کہا "میں ایک مسافر ہوں، آپ سے اجازت لینے آیا ہوں کہ رات آپ کی حویلی میں گزاروں۔ میں نے سنا ہے کہ حویلی خالی پڑی ہے۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟" سوداگر نے سپاہی سے کہا "تم اپنی زندگی سے کیوں بیزار ہو۔ بھائی جاکر دوسرا ٹھکانہ تلاش کرو، اس بستی میں اور بھی بہت سے گھر ہیں۔ میری حویلی میں تو جنوں کے آستانے ہیں۔ وہاں سے ان کو نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔"

"شاید میں ان کو وہاں سے بھگانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ کیا پتہ وہ جن ایک پرانے سپاہی کا کہنا مان جائیں۔"

"نہیں بھائی اور بھی بہت سے لوگ قسمت آزما چکے ہیں مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا۔ پچھلے سال بھی

ایک مسافر آیا تھا اور اس نے بھی جنوں کو بھگانے کی کوشش کی تھی۔ رات کو حویلی میں ٹھہرا تھا مگر صبح سوائے ہڈیوں کے کچھ بھی نہیں ملا۔ جن تمہارا بھی ایسا ہی حشر کر دیں گے۔ "

سپاہی نے یہ سن کر کہا "مگر ایک سپاہی کو مارنا مشکل کام ہے۔ میں نے پچیس سال نوکری کی ہے۔ کئی جنگیں لڑی ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ کے سامنے زندہ سلامت ہوں۔ میں ان جنوں سے خود ہی نپٹ لوں گا۔ آپ صرف اجازت دے دیں۔ " سوداگر سوچ میں میں پڑ گیا اور پھر سپاہی سے کہا اچھا سپاہی! تم اپنا برا بھلا خود ہی جانو۔ اگر تم بہادر ہو تو بے شک میری حویلی میں جا کر رہو۔ اگر تم ان جنوں کو بھگانے میں کامیاب ہوئے تو میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔ "

سپاہی نے سوداگر سے کہا "تو پھر مجھے تھوڑی سی موم بتیاں۔ کچھ اخروٹ اور ایک شلجم پانی میں ابال کر دیں۔ " سوداگر نے سپاہی کو مطلوبہ چیزیں منگوا کر دیں۔ جو اس نے ایک پوٹلی میں ڈالیں اور حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

سپاہی حویلی پہنچ کر ایک کمرے میں رکھی ہوئی چارپائی پر مزے سے لیٹ گیا۔ رات کے بارہ بجتے ہی چاروں طرف ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ دروازے، کھڑکیاں کھڑ کھڑ کرنے لگے۔ زور زور سے چیخنے اور چلانے کی آوازوں سے سپاہی کے کانوں کے پردے پھٹنے کو تھے۔ مگر اس نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اخروٹ توڑ کر کھائے اور اور پائپ سلگا کر پینے لگا۔ اچانک! کمرے کا دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھلا اور ایک جن نے دروازے سے جھانکا، پھر چیخ کر بولا "ارے یہاں تو ایک آدم زادہ بیٹھا ہے، جلدی کرو شکار بہت اچھا ہے۔ " یہ سن کر تمام جن دھم دھم کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور سپاہی کے چاروں طرف اچھلنے کودنے لگے۔ کبھی وہ سپاہی کا منہ چڑاتے اور کبھی وہ ایک دوسرے کو اشارہ کر کے بتانے لگے کہ "ہم اس کی بوٹی بوٹی کر کے کھائیں گے۔ "

"خاموش ہو جاؤ اور شور نہ کرو۔ میں نے تم سے بڑے بڑے جن دیکھے ہیں۔ " سپاہی نے جنوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا "انہوں نے بھی مجھے ایسا ہی کہا تھا۔ مگر میں نے ان کو جو سزا دی تھی وہ زندگی بھر نہیں بھول پائیں گے۔ " اس پر جنوں کا سردار اچھلتا کودتا سپاہی کی طرف بڑھا اور کہا "اچھا اگر یہ بات ہے تو میدان میں آ جاؤ۔ "

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ " سپاہی نے کہا "پہلے یہ بتاؤ کہ تم میں سے ایسا کون سا دلیر ہے۔ جو پتھر کو نچوڑ کر اس میں سے پانی نکال کر دکھائے؟ "

جنوں کے سردار نے حکم دیا کہ "ایک پتھر حاضر کیا جائے۔ " ایک جن دوڑ کر پتھر لے آیا۔ جنوں کے سردار نے پتھر لے کر دونوں ہاتھوں سے نچوڑا تو پتھر مٹی مٹی ہو گیا۔ اور کہنے لگا "دیکھا۔ " "لیکن اس میں سے پانی تو نہیں نکلا۔ " سپاہی نے کہا اور پوٹلی میں سے شلجم نکال کر سب کو دکھایا

اور کہا "دیکھو یہ پتھر تمہارے پتھر سے کہیں بڑا ہے۔ اب تماشہ دیکھنا۔" یہ کہہ کر اس نے شلجم کو نچوڑا تو اس میں سے پانی نکل آیا۔ یہ دیکھ کر جنوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پھر سپاہی کو اخروٹ کھاتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا "یہ تم کیا کھا رہے ہو؟"

"اخروٹ کھا رہا ہوں۔ "مگر تم میں سے کوئی بھی میرے اخروٹ توڑ نہیں سکتا۔" یہ کہہ کر سپاہی نے بندوق کی ایک گولی جنوں کے سردار کے ہاتھ میں دی اور کہا کہ "یہ لو اور اس اخروٹ پر بھی زور آزمائی کر کے دکھاؤ" جن نے گولی کو منہ میں ڈال کر چبانے کی کوشش کی مگر اس کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ ادھر سپاہی مزے سے اخروٹ کھانے لگا۔ تمام جنوں کی حالت بہت بری تھی۔ سپاہی نے اب دوسری ترکیب آزمائی اور جنوں سے کہا میں نے سنا ہے کہ آپ لوگوں کو بہت سے حیرت انگیز کملات آتے ہیں۔ کبھی آپ لوگ بڑے سے چھوٹے اور کبھی چھوٹے سے بڑے ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ تم لوگوں کو یہ کمال بھی حاصل ہے کہ پلک جھپکتے میں ایک چھوٹی سی پوٹلی میں سما جاتے ہو۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ یہ تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" سارے جن چیخ کر بتانے لگے۔

"اچھا میں تم لوگوں کا امتحان لیتا ہوں۔ تم سب لوگ جلدی سے میری پوٹلی میں سما جاؤ۔" سپاہی نے کہا۔ یہ سنتے ہی تمام جن ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے جلدی جلدی پوٹلی میں گھس گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے حویلی جنوں سے خالی ہو گئی۔ سپاہی نے فوراً پوٹلی کا منہ بند کیا اور رسی سے اسے باندھ دیا۔ "واہ واہ!" سپاہی نے کہا "اب میں مزے سے سو سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر سپاہی نے اپنا بوریا بستر نکالا اور بچھا کر سو گیا۔

اگلے دن سوداگر نے اپنے آدمیوں کو بلایا اور کہا "جاؤ دیکھ کر آؤ کہ سپاہی زندہ ہے یا مر کھپ گیا۔" تمام لوگ حویلی گئے تو دیکھا کہ سپاہی تو مزے سے پائپ پی رہا ہے۔ وہ حیران ہو گئے اور سپاہی سے کہا۔ "ہم لوگ تو سمجھ رہے تھے کہ جنوں نے تمہیں مار دیا ہو گا۔"

سپاہی نے ہنس کر کہا "اچھا اچھا! اب دیر نہ کرو۔ جلدی سے اس پوٹلی کو اٹھاؤ اور لوہار کے پاس لے جاؤ۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔" لوگوں نے جلدی سے پوٹلی اٹھائی اور لوہار کی دوکان پر پہنچے۔ سپاہی نے لوہار سے کہا "تم دو تین آدمیوں کے ساتھ مل کر اس پوٹلی پر ہتھوڑے برساؤ اور اچھی طرح کٹائی کرو۔" بس پھر کیا تھا۔ لوگوں نے ہتھوڑے برسانا شروع کر دیئے۔ پوٹلی کے اندر سے جنوں کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ سپاہی بھی زور زور سے کہہ رہا تھا۔ "شاباش اچھی طرح سے ہتھوڑے برساؤ۔ بے گناہ لوگوں کو ستانے کا یہی نتیجہ ہے کہ آج ایسی سزا مل رہی ہے۔"

تمام جن رونے لگے اور بے چارگی سے کہنے لگے "ہماری جاں بخشی کر دو۔ ہم نہ صرف یہ گھر

چھوڑ دیں گے بلکہ یہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں گے صرف ہمیں زندہ چھوڑ دو۔ ہم تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے۔ " یہ سن کر سپاہی نے لوگوں کو روکا اور پوٹلی کا منہ کھولا اور صرف جنوں کے سردار کو پوٹلی میں اندر رہنے دیا۔ سپاہی نے جنوں کو کہا "جب تک میرا انعام نہیں ملے گا۔ تب تک سردار پوٹلی میں بند رہے گا۔"

سارے جن بھاگ کر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوٹا سا جن پوٹلی لایا اور سپاہی کے حوالے کیا کہ "یہ تمہارا انعام ہے۔" سپاہی نے پوٹلی کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر جنوں سے کہا میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اب میں تمہارے سردار کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" یہ بات سن کر جنوں کے سردار نے پوٹلی کے اندر سے کہا "سپاہی جلدی مت کرنا۔ پہلے میری بات سن لو یہ پوٹلی بہت کام کی ہے۔ تم جس چیز کی دل میں خواہش کرو گے۔ وہ اس پوٹلی میں آجائے گی۔ تم صرف یہ کرنا کہ جو چیز تمہیں چاہئے۔ نام لے کر کہنا کہ "آجاؤ اس پوٹلی میں" تو وہ چیز پوٹلی میں اسی وقت آجائے گی۔"

"اچھا اسے تو ابھی آزمانا چاہئے۔" سپاہی نے کہا اور پھر کہا کہ پوٹلی میں اچھے کھانے آجائیں" اچانک اسے لگا کہ پوٹلی بھاری ہو گئی ہے۔ اب جو پوٹلی کھول کر دیکھا تو واقعی اس میں بہترین قسم کے کھانے رکھے ہوئے تھے۔ سپاہی نے کھانا پوٹلی سے نکال کر سب لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر وہ دوکان سے باہر آیا اور دیوار پر بیٹھی چڑیا کو دیکھ کر کہا چل آجا میری پوٹلی میں" چڑیا اڑتی ہوئی پوٹلی میں آگئی۔

سپاہی واپس دوکان پر آیا اور جنوں کے سردار کو کہنے لگا "تم نے واقعی مجھ سے ایمانداری کی ہے۔ میں تمہیں اس ایمانداری کے صلے میں آزاد کرتا ہوں۔ یہ پوٹلی مجھ بوڑھے سپاہی کے کام آئے گی۔" یہ کہہ کر سپاہی نے نے جنوں کے سردار کو آزاد کر دیا۔ اور اس سے کہا جاتے جاتے کان کھول کر سن لو۔ اگر تم دوبارہ نظر آئے تو وہ سزا ملے گی کہ عمر بھر یاد رکھو گے۔ چلو اب بھاگ جاؤ۔" جن فوراً بھاگ گیا اور سپاہی بھی اجازت لینے سوداگر کے پاس آیا۔ سوداگر، سپاہی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ لیکن سپاہی نے اس کی حیرانی دور کی اور اسے تمام واقعہ سنایا پھر سوداگر سے کہا۔ "میں نے جو کام کرنا تھا کر دیا اب آپ سے اجازت لینے آیا ہوں۔" لیکن سوداگر نے سپاہی کو رات اپنے گھر میں مہمان بنایا اور خود حویلی میں سویا تاکہ اطمینان کر سکے کہ واقعی اب حویلی میں جنوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ صبح جب اسے اس بات کی تسلی ہو گئی کہ جن واقعی بھاگ گئے ہیں۔ تو اس نے سپاہی کو بہت سا انعام دینا چاہا۔ مگر سپاہی نے اس سے کہا "مجھے انعام و اکرام کی ضرورت نہیں۔ جنوں نے مجھے ایسی چیز دی ہے جو میری بقیہ زندگی میں کام آئے گی۔"

اس طرح سپاہی سوداگر سے اجازت لے کر اپنے گاؤں پہنچا اور اپنے ماں باپ کی خدمت کرنے لگا۔

ادیب دوستوں سے گزارش

آپ اپنی جو تحریر بھی ہمیں بھجوائیں اُس کی پشت پر اپنا نام اور پتا لکھنا نہ بھولیں

****

اکثر ساتھی خط پر لکھے ہوئے پتے پر اکتفا کرتے ہیں جو درست نہیں

****

درج ذیل قلمکاروں سے جن کی تحریریں آنکھ مچولی میں شائع ہو چکی ہیں گذارش ھے کہ وہ اپنے مکمل پتوں سے ھمیں جلد از جلد آگاہ کریں۔

۱ احسان اللہ احمد ۲ نعمان طاہر شمسی ۳ شمع سرور ۴ محمد افضل شاہین
۵ نائلہ صدیقی ۶ ایم شہزاد احمد ۷ محمد تنویر شعیب

یہ بات سمجھ میں آئی نہیں

ٹریفک کی بتی سُرخ ہو تب بھی اکثر لوگ رُکنا پسند نہیں کرتے۔
بس کے انتظار میں قطار بنا کر کھڑے ہونے کو ہم اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔
راہ چلتے تھوک دینا ہمارے نزدیک کوئی معیوب بات نہیں۔

ایسا کیوں ھوتا ھے؟

یہ بات سمجھ میں آئی نہیں!

ایسی کوئی بھی بے قاعدگی، بدنظمی یا لاپرواہی جسے دیکھ کر آپ کو غصہ آتا ہو اور آپ بھی ہماری طرح سوچتے ہوں کہ... یہ بات سمجھ میں آئی نہیں! تو آپ... ایسی اُلجھن ایک سطر میں لکھ کر ہمیں بھجوا دیجئے۔ ہم اگست سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے میں آپ کے نام کے ساتھ ضرور شائع کریں گے۔ ممکن ہے اس طرح اصلاح کی کوئی صورت نکل آئے۔

وقاص کو غصّہ کیوں آتا ہے

سیّد کاشان جعفری

اُن دنوں اساتذہ کی تربیت کے سلسلے میں میرا تقرر انگلش ماڈل اسکول میں ہوا تھا۔ اصل میں یہ میری عملی تربیت کا کورس تھا۔ جسے مکمّل کرنا ضروری تھا۔ انگلش ماڈل اسکول کا انتخاب اس لئے عمل میں آیا کہ وہاں کے ہیڈ ماسٹر ممتاز صاحب نے بچّوں کی نفسیات میں فرانس سے خصوصی ڈپلوما حاصل کیا ہوا تھا۔ ہاسٹل انچارج بیگم آفرین لندن سے بچّوں کی دیکھ بھال تربیت اور جدید نفسیات کی تربیت لے کر آئی تھیں۔ اور یہاں کا ہر ٹیچر اپنے پیشے میں تربیت یافتہ تھا۔ میرے اساتذہ کا خیال تھا کہ عملی تربیت اور مشاہدے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور ماڈل اسکول شہر میں نہیں ہے۔

جس وقت میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے سجے ہوئے خوبصورت دفتر میں داخل ہوا۔ اُن کے رُو برُو ایک کمسن طالب علم کا مقدمہ درپیش تھا... کمسن طالب علم وقاص نو دس سال کی عمر کے درمیان کا دُبلا پتلا چوتھی کلاس

کا طالب علم تھا۔ اس کے کلاس ٹیچر شیرازی بھی وہیں موجود تھے۔ اور وقاص کی فردِ جرم ہیڈ ماسٹر صاحب کے گوش گزار کر رہے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ لڑکا (وقاص) نہ خود کلاس میں پڑھتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو پڑھنے دیتا ہے۔ اس نے کلاس روم کی کھڑکی کا شیشہ بھی جان بوجھ کر توڑا ہے۔۔۔ یہ اپنا ہوم ورک بھی کر کے نہیں لاتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

شکایت ختم ہوئی تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے وقاص کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔۔"وقاص میاں۔۔۔ آخر آپ کب سمجھیں گے۔۔۔؟ آپ نے کلاس روم کا شیشہ کیوں توڑا۔۔۔؟ آپ کلاس میں توجہ کیوں نہیں دیتے۔۔۔ اور ہوم ورک کیوں نہیں کر کے لاتے۔۔۔؟ پھر دوسرے طلبہ کو بھی آپ ڈسٹرب کرتے ہیں۔ کیوں؟

وقاص بڑی بے خوفی کے ساتھ جواب میں بولا۔۔"جی یہ سچ ہے کہ شیشہ مجھ سے ٹوٹا ہے۔۔۔ مگر اسے میں نے جان بوجھ کر نہیں توڑا۔ اور یہ الزام ہے کہ میں دوسرے طلبا کو ڈسٹرب کرتا ہوں۔۔۔ مجھے سر نے ہوم ورک نہ کرنے کی سزا دے کر پہلے ہی کلاس روم سے باہر نکال دیا تھا۔۔۔ میں وہاں اکیلا کھڑا کھڑا کیا کرتا، سیٹی بجانے لگا۔ اور یہ مجھے یہاں لے آئے۔ کھینچتے ہوئے۔ کیا میں انسان نہیں، جانور ہوں۔۔" اُس نے جواب دیتے، دیتے آخر میں ایک سوال بھی کر دیا۔

"آپ نے کھڑکی کا شیشہ کیوں توڑا۔۔۔"ہیڈ ماسٹر صاحب اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے درشتگی سے بولے۔

وقاص نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بڑی بے خوفی سے اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے کھڑا اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اُس کی بے باکی سے تنگ آکر چپراسی کو حکم دیا کہ وہ اُسے باہر لان میں چھوڑ آئے۔

بچے سے فارغ ہو کر ہیڈ ماسٹر صاحب میری جانب متوجہ ہوئے اور بڑے خلوص سے پوچھا۔۔"کہیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔۔۔؟"

"جی میرا نام ارمغان شاہین ہے۔۔۔ مجھے یہاں ٹیچر ٹریننگ کی عملی تربیت اور مشاہدے کے لئے بھیجا گیا ہے۔" کہتے ہوئے میں نے اپنا تعارفی خط ان کے سامنے رکھ دیا۔

خط پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔۔۔ مسٹر ارمغان۔۔" پھر قدرے جھینپتے ہوئے بولے۔۔۔"میں نے نیویارک یونیورسٹی سے بچوں کی نفسیات کے موضوع پر (پی ایچ ڈی) کیا ہوا ہے۔ مگر اس بچے (وقاص) نے تو میرا ناک میں دم کر کے رکھ دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔۔۔ کچھ بتاتا بھی نہیں اور حرکتیں سزاؤں والی کرتا ہے۔ میں اکیلا نہیں اس کے تمام ٹیچر بھی اس سے نالاں ہیں اس سے" کہتے ہوئے انہوں نے بُرا سا منہ بنایا۔"ابھی آپ نے خود کلاس ٹیچر کو اس کی شکایتیں کرتے سُنا ہوگا۔" لمحے بھر ٹھہر کر وہ پھر بولے۔ اسی دوران وہ بچہ پھر وہاں آگیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ شاید وہ

دوڑتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا۔ یا پھر جدّوجہد کرکے۔ کیونکہ جب اُسے یہاں سے لے جایا گیا تھا تو چپراسی نے اُس کا ہاتھ بڑی سختی سے پکڑا ہوا تھا اور تقریباً اُسے وہاں سے گھسیٹتا ہوا سا لے گیا تھا۔ وہ بڑی بے خوفی کے عالم میں بولا "میں سچ بولتا ہوں تو آپ مجھے سزا دیتے ہیں اور تلقین یہ کی جاتی ہے کہ سچ بولو... سانچ کو آنچ نہیں... اور خود آپ لوگ نہ صرف جھُوٹ بولتے ہیں بلکہ ہمیں بھی جھُوٹ بولنے پر مجبور کرتے ہیں۔"

اس جملے کو سُنتے ہی ہیڈ ماسٹر صاحب چراغ پا ہو گئے۔ اسی دوران وہ چپراسی بھی وہاں آچکا تھا۔ گرج کر بولے "لے جاؤ اسے یہاں سے۔ خبردار اب یہ یہاں دوبارہ نہ آنے پائے..." چپراسی تعمیل حکم میں وقاص کو لے کر چلا گیا۔ وہ پھر کچھ نہیں بولا۔ ہاں اُس کی نگاہیں ضرور آگ برسا رہی تھیں۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر اُس کا بس چلے تو بہت کچھ کر گزرے گا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اب پھر میری طرف متوجہ ہو گئے... کہنے لگے۔ "دیکھئے ہمارے اسکول میں بچّوں کی مار، دھاڑ پر قطعی پابندی ہے۔ کسی بھی ٹیچر کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی بچّے کو مار کی سزا دے۔ ہم مختلف نفسیاتی طریقوں کو بروئے کار لاکر بچّے کو راہِ راست پر لاتے ہیں۔ اب وہ زمانہ لد گیا جب بچّوں کو موٹے موٹے رول یا پتلی پتلی قمچیوں کی مدد سے مار کر انہیں مُرغا بنا کر پڑھایا جاتا تھا۔" پھر توقف کرکے بولے "مسٹر شاہین اس بچّے کو بطورِ خاص میں آپ کے سپُرد کرتا ہوں۔ اسے آپ اپنے لئے چیلنج کیس سمجھئے... شاید یہ آپ کو کچھ بتا دے۔ آپ نئے ہیں... ہم لوگ تو اپنا ہر حربہ آزما چکے ہیں۔"

"ٹھیک ہے... میں وقاص کو چیلنج کیس تو نہیں۔ ٹیسٹ کیس کی حیثیت سے قبول کرتا ہوں... ہاں آپ ذرا تفصیل سے یہ اور بتا دیں کہ آپ لوگوں نے اس سلسلے میں کیا کچھ کیا ہے۔"

"کئی بار سوالات کی فہرست اس بچّے کے والدین کو بھجوائی۔ مثلاً گھر میں سوتیلی ماں تو نہیں ہے۔ بیجا سختی کا سلوک تو نہیں کیا گیا اس پر... بچّہ کسی محرومی کا شکار تو نہیں ہے... وغیرہ، وغیرہ... ان سوالوں کے جوابات موصول ہوئے۔ مگر اُن سے کوئی مدد نہیں ملی۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ وقاص کے سلسلے میں گھریلو حالات کو زیادہ اہمیّت دے رہے ہیں۔ میرے خیال میں اس کے احساسات و خیالات جاننے کے لئے ہمیں اس کے ساتھ خصوصی توجہ اور محبّت کا سلوک اختیار کرنا ہوگا۔ اور ایسی محبّت کا سلوک صرف ماں کی طرف سے ہو سکتا ہے... آپ نے اس بچّے کی ماں سے تعاون کی درخواست کی...؟" میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے دریافت کیا۔

ہوں... آپ کا سوال اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ وقاص کی والدہ بھی ملازمت کرتی ہیں اور اسی وجہ سے اُسے ہاسٹل میں چھوڑا گیا ہے۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کسی گہری سوچ سے نکلتے

ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں"، کہتا ہُوا میں اُن کے دفتر سے باہر نکل آیا۔ اور اسکول کے وسیع و عریض لان میں میری نگاہیں اس بچّے کو تلاش کرنے لگیں۔ وقاص مجھے لان کے عین بیچوں بیچ بنے ہوئے حوض کے کنارے بیٹھا نظر آگیا۔ وہ اُس وقت بالکل عام سا معصوم اور بھولا بھالا بچّہ نظر آرہا تھا۔ وہ قریب پڑی ہوئی ریت میں سے چھوٹے چھوٹے کنکر اُٹھاتا اور حوض میں ڈال دیتا پھر کنکر گرنے سے جو دائرے بنتے ہوئے پھیلتے انہیں بڑے انہماک سے دیکھتا۔ میں خاموشی سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا اُس کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ اور خود بھی وہی عمل کرنے لگا۔ جو وہ کر رہا تھا۔

چند لمحے تو وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر خود ہی اُس نے مجھ سے سوال کیا "سر! کیا آپ یہاں نئے آئے ہیں۔ آپ ہمیں پڑھائیں گے؟"

میں نے اُس کی طرف مُسکرا کر دیکھا۔ تاکہ ہمارے درمیان اجنبیت کا احساس نہ رہے۔ پھر بڑے نرم لہجے میں کہا... "جی ہاں بیٹے! میں یہاں نیا آیا ہوں" پھر اُسے مزید اپنائیت کا احساس دلانے کے لئے کہا "بیٹے! آپ مجھے سر نہیں... انکل کہیں... ویسے بھی میں ابھی مکمل ٹیچر نہیں بنا ہوں۔ یہاں ٹریننگ کے سلسلے میں آیا ہوں" یہ کہتے ہوئے میری نگاہیں اُسی کے چہرے پر تھیں۔ میں نے دیکھا میری بات سن کر اُس کے چہرے پر خوشگوار اثرات ظاہر ہوئے۔ کچھ دیر قبل کی سختی اور آنکھوں میں بھرا ہوا غصّہ کافی حد تک کم ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے قریب آبیٹھا۔ اس کا مطلب صاف یہ تھا کہ میں اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس پہلی کامیابی نے میری رہی سہی ساری جھجھک دُور کر دی۔ اِدھر اُدھر کی کچھ باتیں کرنے کے بعد میں مطلب کی گفتگو پر آگیا۔ میں نے بڑے ہمدردانہ انداز میں اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"وقاص بیٹے! وہ کیا بات تھی کھڑکی کا شیشہ توڑنے والی؟"

"انکل! میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں، اور یہ لوگ ہمیشہ سچ بولنے کی سزا دیتے ہیں۔ آپ بھی شاید یقین نہ کریں مگر حقیقت یہی ہے کہ شیشہ میں نے جان بوجھ کر نہیں توڑا۔ بلکہ اچانک ٹوٹ گیا۔ حالانکہ غلطی میری نہیں تھی۔ زاہد سر کا لڑکا بھی میرے ساتھ گیند کھیل رہا تھا۔ اور اُسی نے میری طرف گیند کھینچ کر ماری تھی۔ میں گیند کے نشانے سے بچنے کے لئے کھڑکی پر سے نیچے کُود گیا۔ گیند شیشے پر لگی اور وہ ایک چھناکے کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ زاہد سر نے اپنے لڑکے کو سزا سے بچانے کے لئے سارا الزام مجھ پر تھوپ دیا"۔ وقاص نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا

میرے لئے ابھی کوئی فیصلہ کر لینا مشکل تھا۔ ویسے مجھے اس کی بات میں صداقت کی بُو آئی۔ سچ بولنے والوں میں یہ خصوصیت عام طور پر دیکھی جاسکتی ہے کہ ان میں جھجھک نام کی کوئی بات نہیں ہوتی اور وقاص جس بے باکی سے

ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے بات کر رہا تھا۔ میں اُس سے ہی اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ اس کے نام سے منسوب کر کے جو فردِ جرم سُنائی جا رہی ہے اس میں صداقت کے بجائے جانبداری ہے ..." اچھا یہ جھوٹ بولنے والی بات کیا ہے ؟" میں نے اُس سے پھر اگلا سوال کیا۔ "جھوٹ بولنے کی بات یہ ہے انکل ...! کہ اس اسکول کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں بچوں کی پٹائی نہیں ہوتی، اُنہیں مارا پیٹا نہیں جاتا۔ جدید نفسیاتی اصولوں اور طریقوں کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ اب یہ دیکھیے آپ یہ نشانات ..." کہتے ہوئے اُس نے اپنی شرٹ کی آستین اوپر اُٹھا دی۔ اُس کے بازو پر کئی جگہ سُرخ سُرخ نشان تھے۔ جیسے کسی نے اُسے بُری طرح نوچا ہو۔

"ارے یہ کیا ...! یہ کس نے تمہیں نوچا ہے ؟ اس بے رحمی سے۔" میرے منہ سے وہ نشانات دیکھتے ہی بےساختہ نکلا ...

" انکل ! یہ ہمارے ٹیچروں کے انعامات ہیں۔ بلاشبہ یہ لوگ مارتے پیٹتے نہیں بلکہ نوچتے ہیں اور اس طرح نوچتے ہیں کہ نشان پڑ جائیں۔" پھر ہم دونوں وہیں لان میں ساتھ کھیلنے لگے۔ اب وہ مجھ پر پوری طرح اعتماد کرنے لگا تھا۔ اور میرا دوست بن چکا تھا۔ کھیلتے کھیلتے میں ایک جگہ اچانک جان بوجھ کر گر پڑا۔ اُس نے مجھے گرتا ہوا دیکھا تو فوراً مدد کے لئے میری طرف لپکا ... اتنی دیر میں اُٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔" انکل ! آپ کو چوٹ تو نہیں لگی۔" کہتے ہوئے اُس کے لہجے میں ہمدردی نمایاں تھی۔ "ہاں لگی تو ہے۔ مگر ایسی نہیں کہ فکر کی جائے۔" میں نے جواب میں کہا۔

"چھوڑیئے ... اسی بھاگ دوڑ کے کھیل کو ... آیئے ہم وہاں درخت کے نیچے سنگِ مرمر کی بنچ پر بیٹھ کر باتیں کریں۔" اُس نے کہا۔

میں نے فوراً ہی اُس کی بات مان لی۔ کسی سے اپنی بات منوانے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کی بات بھی مانی جائے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور اس درخت کے نیچے آ بیٹھا جہاں اُس نے اشارہ کیا تھا۔

"میرا بس چلے تو اُس کمبخت کو گولی مار دوں۔" اُس نے میرے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی یہ کیا بات ہوئی۔ خواہ مخواہ کس کمبخت کی شامت آگئی۔ جو علی الاعلان گولی مارنے کا ارادہ کر لیا۔" میں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

" اُسی چپراسی کو " اُس نے لاپرواہی سے کہا۔

" کیوں خیر تو ہے۔ کیا قصور کیا ہے چپراسی نے ؟"

" وہ، وہ کہتا ہے کہ میں پاگل ہوں۔ وہ مجھے پاگل سمجھتا ہے۔ انکل ! کیا میں پاگل ہوں۔ آپ کو میں پاگل لگتا ہوں۔" اُس نے تلخی بھرے انداز میں کہا۔

"نہیں وقاص میاں۔ پاگل ہوں آپ کے دشمن۔ آپ تو بہت پیارے اور ذہین بچے ہیں۔ آپ کو تو دوسروں

کی تکلیف کا بھی بہت خیال ہے۔"

"اب دیکھئے نا یہ میری آپ سے پہلی ہی ملاقات تو ہے۔ مگر آپ نے میرے گرنے کا اتنا اثر لیا کہ کھیل چھوڑ کر یہاں آ بیٹھے۔ پاگل ایسے تھوڑا ہی ہوتے ہیں..."

اپنی تعریف سُن کر وہ ہولے سے مُسکرا دیا۔ بولا کچھ نہیں۔ قدرے ٹھہر کر میں نے اُس سے کہا: "میں تمہارے ڈیڈی کے پاس جاؤں گا۔ اور اُن سے کہوں گا کہ وقاص کو ایسے اسکول میں کیوں ڈال رکھا ہے جہاں سب جھوٹ بولتے ہیں۔"

"سچ... انکل... واقعی آپ میرے ڈیڈی سے مل کر یہ بات کہیں گے؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ آپ مجھے اور تفصیل سے بتائیں کہ یہاں کے لوگ اور کیا کیا جھوٹ بولتے ہیں؟"

"دو جھوٹ تو آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔ تیسرا جھوٹ یہ ہے کہ ہاسٹل میں بچّوں کے لئے بالکل گھر کا سا ماحول دیا جاتا ہے۔ وہ ہماری ہاسٹل انچارج ہیں نا۔ وہی جن کو بیگم آفرین کہتے ہیں۔ لندن سے تربیت لے کر آئی ہیں۔ صبح سویرے بچّوں پر گرم، گرم پانی اُنڈیل دیتی ہیں۔ انہیں اٹھانے کے لئے، کیا لندن سے یہی تربیت لے کر آئی ہیں بچّوں کو اُٹھانے کی؟ یہ بھی نہیں دیکھتیں کہ پانی کتنا گرم ہے۔ کھانا کھانے کے بعد اپنے برتن، پلیٹیں، ہمیں خود دھونی پڑتی ہیں۔ چھوٹے بچّے برتن دھونے کے لئے نل کے پاس جاتے ہیں تو بڑے لڑکے ہمیں بھگا دیتے ہیں۔ ہم سردی سے کپکپاتے ہیں تو کوئی خشک تولیہ بھی نہیں دیتا۔ ہماری حالت پر سب قہقہے لگاتے ہیں۔ بتائیے انکل! کیا اسی کا نام پیار ہے۔"

کہتے کہتے اُس کا منہ ایسے بن گیا۔ گویا کسی نے اُس کے منہ میں زبردستی کونین ڈال دی ہو...

"یہ تو واقعی بڑی زیادتی ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچائے دیتا ہوں اور یہاں سے نام خارج کرا کے کسی دوسرے اچھے اسکول میں داخل کرا دوں گا۔" میں نے پوری پوری ہمدردی کا اظہار کیا۔

"اس سے کیا فرق پڑے گا۔ گھر پہ بھی تو مصیبت ہے۔" اُس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"کیا مصیبت ہے؟"

"ایک ہو تو بتاؤں۔ میرے ڈیڈی اپنے کاروبار کے سلسلے میں مصروف رہتے ہیں۔ ممّی بھی جاب کرتی ہیں۔ دونوں کبھی ہمارے ساتھ مل کر نہیں بیٹھتے۔ کبھی ہماری باتیں نہیں سنتے۔ ہمیں کہیں سیر کرانے نہیں لے جاتے۔ پھر کہتے یہ ہیں کہ میں کماتا کس کے لئے ہوں۔ گھر میں سب کچھ تو ہے۔ ڈیڈی کے بینک میں بہت سارے روپے جمع ہیں۔ ہر سال نئے ماڈل کی کار خرید لیتے ہیں۔ کسی چیز کی کمی نہیں۔ کمی ہے تو بس محبّت کی اور وہ ہمیں نہیں دیتے۔ کمی ہے تو وقت کی وہ اُن سے ہمیں نہیں ملتی۔ ہاں رات، رات بھر پارٹیوں اور کلبوں میں ضائع کرنے کے لئے اُن کے پاس بہت وقت ہے۔ یہی حال ممّی کا ہے۔ کوئی بات پوچھو کہیں گی بیٹا ٹیوٹر کس لئے ہے۔ جاؤ اُس سے معلوم کرو۔ کوئی

ضرورت ہو تو نوکروں کو حکم دو۔ ویسے ممی بڑی سماجی کارکن ہیں۔ دنیا بھر کے لوگوں کی خدمت کرتی پھریں گی۔ بچوں کی بہبودی اور فلاح کے کئی ادارے چلاتی ہیں۔ مگر اپنے بیٹے کو ٹیوٹر اور ملازموں پہ چھوڑ رکھا ہے۔ جیسے میں یہاں ہاسٹل میں رہتا ہوں ویسے ہی گھر پہ رہنا پڑے گا۔ جو مصیبت یہاں ہے۔ وہی وہاں بھی بس چہرے اور جگہ ہی تو بدلے گی۔" وہ ذرا سی دیر کو سانس لینے کے لئے رُکا۔ پھر کہنے لگا۔

"انکل! گزشتہ جمعہ کو میں نماز پڑھنے مسجد گیا تو وہاں مولوی صاحب کہہ رہے تھے "مومن وہ ہے جو اپنے لئے پسند کرے وہی اپنے بھائی کے لئے بھی۔" انہوں نے یہ بھی بتایا کہ "مومن دوسرے مومن کے لئے آئینہ ہے۔ جب آپس میں ملو تو ایک دوسرے کو السلام علیکم کہو۔ مصافحہ کرو۔

انکل! آپ جانتے ہیں نا کہ آئینے میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔ اب ہمارے ٹیچروں کا حال یہ ہے کہ خود سگریٹ پیتے ہیں اور ہمیں سمجھاتے ہیں کہ سگریٹ نوشی صحت کے لئے نقصان دہ ہے۔ اگر یہ نقصان دہ ہے تو وہ خود سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟ یہ تو مومن والی بات نہیں ہوئی۔ اسلام کہتا ہے کہ جب آپس میں ملو تو السلام علیکم کہو۔ مگر یہاں ہمارے سلام کے جواب میں گڈ مارننگ کہا جاتا ہے اور ہمیں بھی گڈ مارننگ کہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ کیا یہ سب جھوٹ نہیں ہے یہ تو مومن والی بات نہیں ہوئی۔ نہ ہی یہ آئینے والی بات ہے۔"

وہ کہتا رہا۔ میں سُنتا رہا۔ پھر جب میں وہاں سے اُٹھا تو فیصلہ کر چکا تھا کہ آج جو کچھ میں نے وقاص سے سیکھا ہے اُس پہ پوری طرح عمل کروں گا۔ نہ صرف خود عمل کروں گا بلکہ دوسرے اساتذہ سے بھی عمل کراؤں گا۔۔۔ وقاص نے جو ایک بچّہ ہے۔ مجھے جو کچھ سکھایا وہ میں کسی بھی ترقی یافتہ ملک کی یونیورسٹی یا انسٹیٹیوٹ میں نہیں سیکھ سکتا تھا۔ اُسے ہاسٹل میں چھوڑ کر میں پھر ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس پہنچا۔ اُنہیں وقاص کی شکایتیں بتائیں۔ انہیں تربیت یافتہ اساتذہ کی کمزوریاں بتائیں۔ اور یہ بھی کہ آج کا بچّہ بہت سمجھ دار بچّہ ہے۔ ہم جو کچھ اُسے سکھانا چاہتے ہیں اُس پہ خود بھی عمل کریں۔ جب تک ہم اپنے کردار کا نمونہ اُن کے سامنے پیش نہیں کریں گے۔ وہ وقاص جیسی اُلجھنوں کا شکار رہیں گے۔ ایسی اُلجھنوں کا حل نفسیات کی کتابوں میں نہیں، خود ہمارے کردار اور ہمارے عمل میں پوشیدہ ہے۔

میری بات ہیڈ ماسٹر صاحب نے مان لی۔ اگلے ہی دن انہوں نے نئی حکمت عملی یعنی جو کہا جائے اُس پر عمل بھی کیا جائے کا اعلان کر دیا۔ میرے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے کہا "مسٹر ارمغان شاہین آپ نے بڑی قیمتی معلومات ایک ہی دن بلکہ چند ہی گھنٹوں میں بہم پہنچا دیں۔ واقعی یہ بہت بڑا کام تھا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ کسی بچّے کو ایسی شکایتوں کا موقع نہیں ملے گا۔ یہ میری ذمّے داری تھی۔ یہ میرا فرض ہے جسے آپ نے پورا کیا۔ اب ایک کام اور کیجئے۔ وہ یہ کہ وقاص کے والدین سے مل کر کسی طرح انہیں بھی ان کے رویّے سے آگاہ کر دیجئے۔ انہیں بھی یہ بتا دیجئے کہ آپ کے بچّے کو آپ کے پیسے کی ضرورت نہیں جتنی آپ کی ذاتی توجہ اور محبّت

کی ہے۔ میں اسی ماہ سے اسکول میں والدین اور اساتذہ کے درمیان ماہانہ میٹنگ کا ایک سلسلہ شروع کر دیتا ہوں تاکہ ہم بچوں کے سلسلے میں ایک دوسرے کی مشکلات کو آسانی سے سمجھ سکیں۔" اپنی بات ختم کرتے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

نجات

لڑکا کہیں سے ایک سیاہ کتّا لے آیا تھا۔ کتّا لڑکے کو بے حد پسند تھا لیکن گھر کے دوسرے لوگ اس سے پریشان تھے۔ لڑکے کے والد نے اس سے کہا۔ "دیکھو! اگر تم نے اس کتّے سے نجات حاصل کر لی تو میں تمہیں پانچ روپے دوں گا۔"

دوسرے روز لڑکے نے اپنے والد کو اطلاع دی کہ اس نے کتّے سے نجات حاصل کر لی ہے۔ اس کے والد نے کہا۔ "یہ تم نے بہت اچھی خبر سنائی۔ یہ لو پانچ روپے۔ اب یہ بتاؤ کہ تم نے کتّے سے کس طرح نجات حاصل کی؟"

لڑکے نے مسکراتے ہوئے رقم جیب میں رکھی اور بولا۔ "میں نے وہ کتّا قدیر کو دے دیا اور اس کے بدلے اس سے دو پلّے لے آیا ہوں۔"

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے

ننھّی نگارشات

نوخیز قلم کاروں کی مختصر تحریروں سے انتخاب

ایک ضروری بات

ادارہ آنکھ مچولی نے بارہا اپنے لکھنے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ نقل شدہ تحریروں کے بجائے ہمیں اپنی ذاتی تحریریں بھجوائیں ۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں، لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود بھی بعض ساتھی ہمیں دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے بھجوا دیتے ہیں ۔ ایسا کرنا بد دیانتی بھی ہے اور تکلیف دہ عمل بھی. نقل شدہ تحریریں بھجوانے کے اس منفی رجحان کو روکنے کے لیے ہم اپنے قارئین ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تمام تحریریں بغور پڑھیں اور اگر چوری کی ہوئی یا نقل شدہ کوئی تحریر دیکھیں تو براہِ کرم فوراً اس کی نشاندہی کریں۔ چوری کی تحریریں بھجوانے والوں کے لیے ہمیں مجبوراً "بلیک بکس" کا ایک سلسلہ شروع کرنا پڑ رہا ہے ۔ یہ گویا ایک چھوٹی سی سزا ہے ۔ جو ساتھی بھی ہمیں نقل شدہ تحریر بھجوائے گا ہم اس کا نام اور پتہ "بلیک بکس" میں شائع کیا کریں گے ۔ نہ صرف یہ بلکہ "آنکھ مچولی" میں آئندہ ان کے نام سے کبھی کوئی تحریر شائع نہ ہو سکے گی۔ (بلیک بکس "ننھی نگارشات کے آخری صفحے پر دیکھیے ۔)

حمد

مرسلہ ...... صائمہ اے زیدی

میرے مولا میرے داتا
ہر اک کا ہے تجھ سے ناتا
جنگل اور پہاڑ بنائے
باغوں میں پھل پھول لگائے
تو نے ہی انسان بنائے
تو نے ہی حیوان بنائے

علم سکھانے والا تو ہے
عقل بڑھانے والا تو ہے
ہم کو سیدھی راہ دکھا دے
نیک بنا دے ایک بنا دے
میرے مولا میرے داتا
سب ہیں تیرے تو ہے سب کا

علم اور محبّت

نائلہ بختیار۔ کوہاٹ

راحیل بابا ہماری گلی کی نکڑ پر رہتے تھے۔ اُن کا گھر تو نہیں تھا۔ البتہ ایک کُٹیا تھی۔ جس کے باہر وہ چھولے بیچتے تھے۔ اُن کے چھولے بڑے مزے دار ہوتے تھے۔ اس لیئے سارا محلہ اُن سے چھولے لیتا۔ اس طرح اُن کی گزراوقات اچھی طرح ہو جاتی۔ وہ کُٹیا میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھے تھے۔ بابا نے پھر ہم سے کہا کہ "دیکھو علم حاصل کرو۔ اور سب سے پیار کرو" ظفر نے آخر آج پوچھ ہی ڈالا کہ بابا تم صرف ایک ہی نصیحت کرتے ہو، اس کے علاوہ کوئی دوسری نصیحت نہیں کرتے۔

بابا کی آنکھیں ایک دم نم ہو گئیں۔ انہوں نے کہا: "یہ ایک لمبی داستان ہے" عائشہ نے کہا "تو بابا سنائیں نا" بابا نے کہا کہ "تم سب ضد کرتے ہو تو میں سُنا دیتا ہوں"۔

یہ ایک عرصہ کی بات ہے جب ہم بہت امیر ہوا کرتے تھے۔ ہماری لاہور میں اپنی کوٹھی تھی۔ ایک لمبی کار تھی۔۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ میرے لئے ابو بہت سے کھلونے لاتے تھے۔ میں اُن کی اکلوتی اولاد تھا۔ لیکن وہ میری جائز خواہش ہی پوری کرتے۔ مجھے پڑھنے لکھنے کا بچپن سے شوق تھا۔ اس لئے مجھے جلد ہی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ نرسری سے پانچویں تک میں اوّل پوزیشن لیتا رہا۔ مجھ سے سب بے حد خوش تھے، لیکن بدقسمتی سے ہماری جماعت میں کچھ ایسے لڑکے آ گئے جو آوارہ تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے مجھے اپنے جال میں پھنسانا چاہا۔ انہوں نے عجیب طریقہ نکالا۔ شروع شروع میں وہ میرے ساتھ ہر وقت پڑھتے رہتے۔ ہم سب سے سارے ٹیچرز بہت خوش تھے۔

مگر یہ لڑکے اپنی خصلت سے مجبور تھے۔ اس لیئے انہوں نے آہستہ آہستہ مجھے ورغلانا شروع کر دیا۔ اب میرا دل پڑھائی سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ میرا وقت زیادہ تر گھر سے باہر گزرتا۔ آہستہ آہستہ میں بیمار سا پڑ گیا۔ گھر والوں کو بہت فکر ہوئی۔ ٹیچرز نے بھی میری شکایات کیں۔ میں اپنی حرکتوں سے بالکل باز نہ آیا۔

پاکٹ منی (جیب خرچ) میں سارا بے کار کاموں میں ضائع کرتا۔ بلکہ اب تو اور بھی پیسے لینے لگا۔ ایک دفعہ نہ جانے انھوں نے مجھے کیا کھلایا کہ میرے منہ سے خون نکلنے لگا۔ میرے ابّو نے میرے علاج کی خاطر اپنی تمام جائیداد خرچ کر دی۔

لیکن علاج سے مجھے تھوڑے دن تو آرام آتا مگر میری حالت پھر ویسی ہو جاتی۔ ابو کی صرف کار بچی تھی۔ اب ہم ایک کچے مکان میں رہنے لگے۔ ایک رات میری طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ باہر بارش بہت تیز ہو رہی تھی۔ میرے ابو نے موسم کی پرواہ کئے بغیر گاڑی باہر نکالی۔ باہر کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ میرے ابو کی گاڑی ایک درخت سے ٹکرائی۔ ابو زخمی ہو گئے اور گاڑی تو بالکل بے کار ہو گئی۔ ابو مجھے بڑی مشکل سے دوبارہ واپس گھر لے آئے میری حالت خراب تھی۔ ابو بے ہوش پڑے تھے، لیکن وہ مجھے میری ماں کے پاس پہنچا کر خود اللہ سے جا ملے۔ میری ماں کا رو رو کر بُرا حال ہو گیا۔ دوسرے دن ابو کو دفن کیا گیا اور مجھے اسپتال پہنچایا گیا۔ میری حالت سنبھلتی نہ تھی۔ ماں کا گھر میں رو رو کر بُرا حال ہو گیا۔ آخر اُسے ہارٹ اٹیک ہو گیا اور وہ بھی مجھے تنہا چھوڑ گئی۔ ایک ماہ بعد مجھے اسپتال سے صحت یاب ہونے کے بعد نکال دیا گیا۔ میں گھر آیا تو گھر اُجاڑ پڑا تھا۔ میرا رو رو کر بُرا حال تھا مگر اس سے کیا ہوتا۔ میرے پاس صرف ۵۰ کا نوٹ تھا۔ میں روتا پیٹتا اس شہر میں آ گیا۔ اور یہاں آ کر چھولے کی دکان کھول لی۔ اب اگر میری بچت ہوتی ہے تو اپنے والدین کی قبر پر چلا جاتا ہوں۔ دل کھول کر رو لیتا ہوں۔ نہ جانے میرے والدین نے میرے لئے کیا کیا سپنے دیکھے تھے۔ مگر میں ... راحیل بابا کی آواز بھاری ہو گئی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر اُمنڈ پڑا۔ باہر بارش

ہلکی ہوگئی تھی۔ ہم نے راحیل بابا سے اجازت مانگی۔ ہم چلنے لگے تو بابا نے کہا۔

"میری نصیحت پہ عمل کروگے نا؟"

ہم سب نے دکھی دلوں کے ساتھ حامی بھرلی۔ آج اس بات کو دس سال گزر چکے۔ بابا کے انتقال کو بھی چھ برس ہو چکے ہیں۔ مگر میں جب کبھی بھی گلی کے نکڑ کے پاس سے گزرتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے راحیل بابا سرگوشی سے کہہ رہے ہوں "میری نصیحت پر عمل کروگے نا؟" اس بات کے احساس سے جانے کیوں میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو بہہ نکلتے ہیں۔

چار کا دلچسپ شمار

مہ جبین اعجاز ، نیو ٹاؤن ، راولپنڈی

چار الہامی کتابیں:۔ توریت، زبور، انجیل، قرآن۔
چار خلفائے راشدین:۔ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ۔
چار مقرب فرشتے:۔ جبرائیلؑ، اسرافیلؑ، میکائیلؑ، عزرائیلؑ۔
چار انسانی دشمن:۔ حسد، جھوٹ، غیبت، چغلی۔
چار پاکستانی صوبے:۔ سندھ، پنجاب، سرحد، بلوچستان۔
چار انسانی خواہشات:۔ دولت، حسن، آزادی، اولاد
چار انسانی عناصر:۔ آگ، پانی، مٹی، ہوا۔

چند مشہور شخصیات کے اصل یا پورے نام

خالد خلیل - کراچی

امام غزالیؒ	ابو حامد محمد بن محمد الطوسی
امام رازی	علامہ فخر الدین ابو عبد اللہ
ابن الہیثم	ابو علی حسن
انار کلی	نادرہ بیگم
ابن بطوطہ	ابو عبد اللہ محمد
ابن صفی	اسرار احمد
اختر شیرانی	محمد داؤد
اے آر خاتون	امت الرحمان خاتون
اکبر الہ آبادی	سید اکبر حسین
اورنگ زیب	محی الدین
آتش	خواجہ حیدر علی۔
آغا خان چہارم	شہزادہ کریم
اثر لکھنوی	جعفر علی خان
امام ابو حنیفہؒ	نعمان بن ثابتؒ
ابوذر غفاریؓ	جندب
امام مالکؒ	ابو عبد اللہ
ابن ماجہ (سائنسدان)	ابو بکر محمد بن یحییٰ
ابن رشد (سائنسدان)	عبد الولید محمد بن احمد ابن محمد
ابن مسکویہ (سائنسدان)	ابو علی احمد بن محمد
بو علی سینا	حسین بن عبد اللہ
بھولو پہلوان	منظور حسین
برق	جوالا پرشاد
پنڈت نسیم	پنڈت دیا شنکر نسیم
حافظ شیرازی	مصلح الدین سعدی
لعل شہباز قلندر	عثمان مروندی
فردوسی	ابو القاسم
شوکت تھانوی	محمد عمر
شیر شاہ سوری	فرید خان
شہزادہ سلیم	نور الدین محمد جہانگیر

غریب طالب علم جو امام بن گیا

صائمہ گل - کراچی

بہت دنوں پہلے کا ذکر ہے کہ مسجد نبوی کے صحن میں ایک بزرگ اپنے شاگردوں کو حدیث پڑھا رہے تھے۔ مسجد نبوی اس مسجد کا نام ہے جو حضرت محمدؐ نے مدینہ شریف میں اس وقت بنائی تھی جب آپ مکہ

شریف سے ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تھے۔ یہ بزرگ اپنے زمانے کے مانے ہوئے عالم تھے۔ دور دور سے لوگ ان سے حدیث پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ سب شاگرد خوب غور سے استاد صاحب کی باتیں سن رہے تھے کہ ایک غریب لڑکا مسجد میں داخل ہوا، اس کا لباس معمولی تھا۔ اس کے پاس تختی تھی نہ قلم دوات۔ لیکن اس کے چہرے سے شرافت ظاہر ہوتی تھی۔ لڑکا مسجد میں داخل ہو کر چپ چاپ ان لڑکوں کے پاس بیٹھ گیا جو حدیث کا سبق پڑھ رہے تھے۔ سب طالب علموں کے پاس قلم، دوات اور کاپیاں تھیں اور استاد صاحب جو کچھ پڑھاتے تھے وہ ساتھ ساتھ لکھتے جاتے تھے۔ آنے والا غریب لڑکا کچھ دیر خاموشی سے استاد صاحب کی باتیں سنتا رہا اور پھر مسجد کے فرش سے ایک تنکا اٹھا کر اس سے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر اس طرح لکھنے لگا جیسے وہ تختی پر لکھ رہا ہو: کبھی کبھی وہ اس تنکے کا سرا اپنے منہ میں لے کر اسے تھوک سے بھگو لیتا تھا، یوں جیسے قلم کی روشنائی سے بھگو رہا ہو: جب لڑکوں کی چھٹی ہوئی اور وہ اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے تو استاد صاحب نے غریب لڑکے کو اپنے پاس بلایا اور کہا "بیٹا جب ہم حدیث پڑھا رہے تھے تو تم بار بار تنکا منہ میں ڈالتے تھے اور اسے تھوک میں بھگو کر اپنی ہتھیلی پر لکھنے لگتے تھے، یہ تو بڑی غلط بات ہے" لڑکے نے ادب سے جواب دیا "جناب میں خدا نہ کرے حدیث کی توہین نہیں کر رہا تھا بلکہ آپ جو کچھ پڑھا رہے تھے اسے میں لکھ رہا تھا" "اگر یہ بات ہے تو آگے آؤ اور ہمیں اپنی ہتھیلی دکھاؤ" استاد نے کہا۔ غریب طالب علم بولا "جناب تھوک تو خشک ہو گیا ہے میرے ہاتھ پر اب کوئی نشان نہیں" "پھر تم نے تنکے اور تھوک سے لکھنے کی کوشش کیوں کی یہ بات تو معمولی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ تھوک بہت جلد سوکھ جاتا ہے"۔ استاد نے کہا "لیکن جناب میں ایسا اس لئے کر رہا تھا کہ مجھے وہ پورا سبق یاد ہو جائے، جو جناب پڑھا رہے تھے اور خدا کے فضل سے مجھے وہ ساری باتیں یاد ہو گئی ہیں اگر آپ فرمائیں تو سناؤں"؟ استاد نے فرمایا "ہاں سناؤ" اس غریب لڑکے نے وہ ساری حدیثیں ٹھیک ٹھیک سنا دیں جو استاد نے پڑھائی تھیں۔ استاد نے اسے سینے سے لگا لیا اور کہا "پیارے بیٹے روز پڑھنے آیا کرو، ہمیں یقین ہے کہ تم بڑے ہو کر بہت بڑے عالم بنو گے" استاد صاحب کی یہ بات بالکل سچ ثابت ہوئی، وہی غریب طالب علم بڑا ہو کر امام شافعیؒ کہلایا اور ایسی عزت اور شہرت پائی کہ ایسی عزت اور شہرت خاص خاص لوگوں کو ہی ملتی ہے۔

اقوالِ زریں

مرسلہ...... محمد پرویز نور

۱۔ محنت کرنے سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

۲۔ جس کی خواہشیں کم ہیں وہی دولت مند ہے۔

۳۔ سچ بولنے سے تمام عیب چھپ جاتے ہیں۔

۴۔ بری صحبت سے تنہائی اچھی ہے۔

۵۔ نرمی سے جواب دینا دوسرے کے غصے کو کم کرنا ہے۔

۶۔ ہر انسان کی زندگی میں تکلیف آتی ہے اس سے نہ گھبراؤ۔

بچّوں کا گیت

مرسلہ :- فیضان عارف ۔جگہ نامعلوم

ہم ہیں دیس کے پیارے بچّے
روشن چاند ستارے بچّے
ہم ہی قوم کا مستقبل ہیں
ہم ہی پاکستان کا دِل ہیں

ہم ہیں آنکھ کے تارے بچّے
روشن چاند ستارے بچّے
ہم ہیں اس گلشن کی کلیاں
ہم سے روشن کوچے گلیاں
ہم ہیں نور کے دھارے بچّے
روشن چاند ستارے بچّے
ہم قائد کا مان بنیں گے
پاکستان کی آن بنیں گے
مل کر گائیں سارے بچّے
روشن چاند ستارے بچّے
ہم اقبالؒ کی شان بنیں گے
ہم ٹیپو سلطان بنیں گے
ہم ہیں راج دلارے بچّے
روشن چاند ستارے بچّے

میرا کیا قصور

○ ...... شاہد اقبال ۔ گوجرانوالہ

" آج میرا دل نہ جانے کیوں بیٹھا جا رہا ہے۔ میری مانیں تو آج آپ کام پر نہ جائیں " بلال کی بیوی رضیہ نے زرد چہرے کے ساتھ کہا۔ اس کا لہجہ انجانا خوف لئے ہوئے تھا۔

" تو، تو بس ایسے ہی ڈر جاتی ہے، بھلا بتاؤ مجھے کیا ہو گا؟ اللہ کی رضا کے بغیر تو ایک پتا نہیں ہل سکتا۔ " بلال حسب معمول نرم مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا اور پھر اپنی بیوی کو تسلی دے کر وہ فیکٹری کے لئے نکل آیا تھا۔

بلال ایک غریب آدمی تھا۔ گھر کے سات افراد کا واحد کفیل، بلا کا محنتی اور کھرا آدمی تھا۔ اسٹیل کے برتن بنانے والی فیکٹری میں مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پال رہا تھا۔ معمولی سی تنخواہ تھی اس کے باوجود اس کی بیوی گھر کو بڑے سلیقے سے چلا رہی تھی۔ وہ ایک شاکر عورت تھی کبھی اللہ کے آگے یا غیروں کے سامنے اپنی غریبی کا رونا نہیں رویا تھا۔

آج کل شہر کے حالات اچھے نہیں تھے، آئے دن جلوس، ہنگامے اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ صبح جب بلال نے مزدوری پر جانے کی تیاری شروع کی تو رضیہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ نجانے کیوں آج اس کو بے قراری سی لگ گئی تھی۔ انجانے وسوسوں سے اس کا دل گھبرانے لگا۔ آخر کار اس نے اپنے خدشے کا اظہار بلال سے کر دیا تھا۔ مگر بلال ہنسی میں ٹال کر کام پر چلا آیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ اس بات پر بلال خود بھی حیران تھا، مگر اس کی وجہ اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس کے ساتھیوں نے بھی یہ بات صاف محسوس کی تھی۔ شام کو جب وہ کام کر کے گیٹ سے باہر نکلا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے آج کا دن ایک سال کا تھا، اس وقت بھی وہ خود پر منوں بوجھ

محسوس کر رہا تھا، ایک ایک قدم اس کے لئے پہاڑ معلوم ہو رہا تھا۔

شام کا اندھیرا لحہ بہ لحہ بڑھ رہا تھا۔ مین سڑک پر اکا دکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ سڑک کے کنارے وہ اپنی سوچ میں مگن چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک تیز رفتار کار عقب سے آئی، یہ گہرے نیلے رنگ کی ٹویوٹا تھی جس کی کھڑکی سے ایک کلاشنکوف جھانک رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ بلال کچھ سمجھ سکتا، تیزی سے فائرنگ کرتی ہوئی کار اس کے قریب سے نکل گئی۔ بے شمار گولیاں بلال کے جسم کو چھلنی کر گئیں۔ بلال کے ساتھ ساتھ سڑک پر چلتے ہوئے تین شخص مزید اس فائرنگ کا نشانہ بن گئے تھے۔

یہ تخریب کار تھے جن کے نزدیک انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنے مذموم ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کچھ نہیں سوچتے کہ ان کے اقدام سے کتنوں پر قیامت بیتے گی، کتنے گھر تباہ ہوں گے، کتنے خاندان اجڑ جائیں گے؟

سڑک پر اس ہولناک واقعہ پر فوراً بھیڑ جمع ہوگئی۔ بلال تو وہیں زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا تھا، جبکہ دوسرے آدمی اسپتال جاکر ختم ہوگئے۔ فیکٹری کارڈ سے بلال کے گھر کا پتا مل گیا، جب بلال کی لہولہان نعش گھر پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا، چیخ و پکار کا وہ منظر سامنے آیا کہ ہر آنکھ برس اٹھی۔ رضیہ پاگلوں کی طرح اپنے مجازی خدا کو آوازیں دے رہی تھی۔

"آپ .... آپ.......... سوئے کیوں ہیں۔ اٹھئے ...... دیکھئے، بچے رو رہے ہیں، یہ سب لوگ کیوں خاموش ہیں؟ آپ...... بولتے ...... کیوں نہیں؟ ...... آپ ...... آ ......" اس سے آگے رضیہ کچھ نہ کہہ سکی۔ صدمہ کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ محلے والوں نے اسے جلدی سے سنبھالا، مگر اب ...... رضیہ تو بالکل بے سہارا ہوگئی تھی۔ دنیا میں اس کا اپنے شوہر کے سوا کوئی بھی تو نہ تھا۔ آنسو اس کا مقدر، آہیں اس کا نصیب اور رنج و غم اس کا مستقبل تھا۔

بلال کی لاش بھی سراپا احتجاج تھی، وہ پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔

"مجھے کس گناہ کی سزا ملی ہے؟ میں نے کون سا جرم کیا تھا؟"

میرا کیا قصور تھا؟ .... مگر...... ان سوالوں کا جواب تو کسی کے پاس نہ تھا۔

اس اجڑے گھر کا کون ذمہ دار تھا؟

یہ سوال مرنے والے کی آنکھوں میں منجمد ہوگیا تھا۔

کاش! ...... ظلم کرنے والے...... ایک پل ...... صرف ایک پل سوچ لیا کریں...... شاید اس طرح ان کو احساس ہوجائے مگر یہ شاید کتنا مشکل کام ہے!

آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی کسی تحریر کو نقل یا سرقہ قرار دینے والے ساتھیوں سے درخواست ہے کہ تحریر جس رسالے سے چوری کی گئی ہے۔ اس کا تراشہ بھی ارسال کریں۔ یا کم از کم اس رسالے یا اخبار کی صحیح تاریخ، مہینہ اور سال کا حوالہ ضرور دیں۔ جہاں سے تحریر نقل کی گئی ہو۔ (ادارہ)

اپنی نگارشات صاف، خوشخط، کاغذ کے ایک جانب ایک سطر چھوڑ کر لکھیں۔

نقل شدہ، طویل اور غیر معیاری تحریریں شائع نہ ہو سکیں گی۔

جو تحریر آپ ہمیں بھجوائیں اس کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں اور ہم سے واپسی کا تقاضہ نہ کریں۔

جواہرات کا ڈبہ

عاصم الدین بفرزون ۔ کراچی

کافروں اور مسلمانوں کے درمیان زبردست لڑائی ہورہی تھی۔ کافروں کی فوج بہت طاقتور تھی۔ اس کے سپاہیوں کے جگ مگ کرتے ہوئے قیمتی ہتھیار اور شاندار وردیاں دیکھ کر دہشت طاری ہوتی تھی۔ اس فوج کا سالار سونے کا تاج رکھے اپنے گرانڈیل گھوڑے کو ادھر سے ادھر دوڑاتا پھر رہا تھا۔

دوسری طرف مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ وہ گنتی میں بھی کم تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی کم تھے۔ وردی تو سرے سے کسی کے پاس تھی ہی نہیں۔ لیکن مجاہدین مطمئن تھے جیسے لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی انہوں نے اپنے دشمن کو شکست دے دی ہو۔

جب دونوں طرف کی فوجیں اپنی صفیں درست کر چکیں اور لڑائی کا بگل بجا تو مسلمان مجاہد اپنے تیز رفتار عربی گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے بجلیوں کی طرح دشمن کی فوج میں گھس گئے اور ان شیخی خورے سپاہیوں کو گاجر اور مولیوں کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔ کافر فوج کے سالار نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس کے سپاہی قدم جما کر لڑیں اور مسلمانوں کے اس زبردست حملے کو روک دیں لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ یہاں تک کہ آسمان پر جگمگانے والا سورج اپنا دن بھر کا سفر کر کے مغرب میں ڈوب گیا اور اس کے ساتھ ہی کافروں کی شان و شوکت بھی ختم ہوگئی۔

مسلمانوں کو حقیر سمجھنے والے کافر سپاہی یوں بھاگے جیسے ڈری ہوئی بھیڑیں اور بکریاں بھاگتی ہیں آپ تو جانتے ہیں نا کہ کافر ہر کام اپنے فائدہ کے لئے کرتے ہیں لیکن سچے مسلمان کا یہ دستور نہیں۔ اس کا ہر عمل اپنے خدا کو خوش کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اس لئے مال غنیمت کے سلسلے میں بھی اسلامی احکام دوسری قوموں سے مختلف ہیں۔ اس جنگ میں اسلامی سپہ سالار نے حضرت عمر بن قصرن ؓ کو مال غنیمت اکٹھا کرنے پر مقرر کیا تھا اور وہ کھلے میدان میں کرسی بچھا کر بیٹھ گئے تھے۔ مجاہد آتے تھے اور سامان آپ کے سامنے رکھ کر چلے جاتے تھے۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ایک مجاہد حضرت عامر بن قیس ؓ ایک خوبصورت ڈبہ ہاتھ میں لئے ہوئے تشریف لائے اور وہ ڈبہ حضرت عمر ؓ کو دے دیا۔ انہوں نے اسے کھول کر دیکھا تو وہ جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔ بلا مبالغہ لاکھوں روپے کے جواہرات ہوں گے۔ یہ ڈبہ کچھ زیادہ بڑا نہ تھا۔ اگر حضرت عمر بن قیس ؓ چھپانا چاہتے تو نہایت آسانی سے چھپا سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ حضرت عمر ؓ اس دیانت داری پر بہت خوش ہوئے۔ اور انہوں نے حضرت عامر ؓ سے کہا کہ مہربانی کر کے اپنا نام تو بتا دیجئے تاکہ اس ایمانداری کا حال سپہ سالار کو سناؤں یقیناً خوش ہوں گے اور آپ کو انعام دیں گے۔"

انعام کا نام سن کر اچھے اچھوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے لیکن جانتے ہو انہوں نے کیا جواب دیا۔ "اگر

مجھے نام ظاہر کرنے پر مجبور نہ کریں تو میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

حضرت عامرؓ نے اپنا نام کیوں نہیں ظاہر کیا؟ اس لئے کہ اسلامی عقیدے کے مطابق وہ جانتے تھے کہ اللہ کے لئے کئے جانے والے کام کا بڑا اجر ہے۔

ہمارے بزرگوں کے دل کیسے پاک تھے۔ اس پاکیزگی اور نیکی ہی کی تو یہ برکت ہے کہ چار چار اور چھ چھ گنا بڑے لشکر ان کے مقابلے میں قدم نہیں جما سکتے تھے۔ اگر ہم بھی ویسے ہی بن جائیں تو ہمیں بھی ویسی ہی برکتیں حاصل ہوں گی۔

مکتب

مرسلہ...... اکرم سیال توقیر

وہ مکتب میں چھٹی کا گھنٹہ بجا
کلاسوں میں ہلچل ہوئی، غل مچا
کہ لڑکے چلے، سب نے رستے لئے
کہ جاتے ہیں بغلوں میں بستے لئے
وہ ٹوپی اچھالی اُدھر دیکھنا
چمکتا ہے تانبا سا سر دیکھنا

ہتھوڑے ہیں پیروں میں یا بوٹ ہیں
خوشی سے اچھلتے ہیں رنگ روٹ ہیں
جو کنکر ہے رستے میں فٹ بال ہے
لڑکپن کی شوخی بھری چال ہے
وہ کتے کو چھیڑا کسی نے اُدھر
بچارے کی تختی سے توڑی کمر
لڑکپن کی چالوں بھری شوخیاں
بلاتی ہیں استاد کی قمچیاں

ایکسرے کیا ہے؟

ارسلان ظہیر گجرات

آجکل ہر جگہ ایکسرے کا بہت نام ہے اور ہو سکتا کبھی آپ نے بھی اپنا ایکسرے کروایا ہو۔ پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا نام ایکس ریز کیوں پڑا۔؟ ریز دراصل شعاعوں کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ شعاعیں آپ کو نظر کیوں نہیں آتیں۔ دراصل روشنی کی شعاعیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ مرئی اور غیر مرئی۔ مرئی شعاعیں وہ ہوتی ہیں جو ہمیں نظر آتی ہیں مثلاً نیلی پیلی وغیرہ، لیکن غیر مرئی شعاعیں ہمیں نظر نہیں آتیں۔ دراصل ان میں سے چند غیر مرئی شعاعیں ایکس ریز ہیں جو ۱۸۹۶ء میں سائنس دان ڈبلیو کے رونتجن نے دریافت کیں اور ان شعاعوں کی وجہ سے ان کا نام ایکس ریز رکھا۔ ایکس ریز ان تیز رفتار شعاعوں کا وہ نظام ہوتا ہے جس کے ذریعے کسی خفیہ چیز کا صحیح عکس سلولائیڈ پر منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ شعاعیں اتنی طاقتور ہوتی ہیں کہ سخت ترین ہڈیوں کے علاوہ بعض سخت دھاتوں میں سے بھی بآسانی گزر جاتی ہیں۔ ایکسرے سے زیادہ تر کام میڈیکل کی دنیا میں لیا جاتا ہے۔ اگر کسی کی ہڈی ٹوٹ جائے تو ایکسرے سے صاف

طور پر پتا چل جاتا ہے کہ وہ ہڈی کہاں سے ٹوٹی ہے اور کتنی ٹوٹی ہے۔ ایکسرے کی دریافت سے دنیائے طب میں انقلاب برپا ہو گیا ہے۔ اس کی مدد سے ڈاکٹر انسانی جسم کے اندر پوشیدہ مہلک اور خطرناک بیماریوں کا پتہ چلا کر اس کا علاج کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایکسرے سے ہیروں کے اصلی اور نقلی ہونے کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ آجکل تو یہ ایجاد اتنی اہمیت اختیار کر گئی ہے کہ یہ اکثرو بیشتر کلینکوں میں بھی موجود ہے پہلے تو کلینیکل لیبارٹریوں میں ہی ایکسرے ممکن ہوتا تھا۔

اسلامی معلومات

مرسلہ۔ شفقت رحمان قریشی۔ اکوڑہ خٹک

۱ ...... کتاب الخلوص توریت کو کہتے ہیں۔
۲ ...... امین الامّت حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کو کہا جاتا ہے۔
۳۔ ...... حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اسلامی شہسوار کے لقب سے مشہور ہیں۔
۴ ...... امام الامّت حضرت ابو بکر صدیقؓ کا لقب ہے۔
۵ ...... ابو سلیمان حضرت خالد بن ولیدؓ کی کنیت تھی۔
۶ ...... ابو عبیدہؓ بن جراح کا اصل نام عامر بن عبداللہؓ تھا۔
۷ ...... رسول اللہ کا حبیب زید بن حارث کو کہا جاتا ہے۔
۸ ...... ابو عبیدہؓ بن جراح کو سیف الاسلام کہا جاتا ہے۔
۹ ...... سعد بن ابی وقاصؓ کو فاتح ایران بھی کہتے ہیں۔
۱۰ ...... ذات النطاقین حضرت اسمٰؓ کو کہا جاتا ہے۔
۱۱ ...... قرآن میں، صحابیوںؓ میں سے صرف حضرت زید بن حارث کا نام آیا ہے۔
۱۲ ...... اسلام کے پہلے شہید مرد حضرت حارث بن ابی حالہؓ ہیں۔
۱۳ ...... اسلام کی پہلی شہید خاتون حضرت سمیہؓ ہیں۔
۱۴ ...... عشرۂ مبشرہ میں سے چھ صحابہؓ نے شہادت پائی۔
۱۵ ...... حضرت امیر حمزہؓ کے گھوڑے کا نام اشعر تھا۔
۱۶ ...... صحابہ کرامؓ میں سب سے پہلے حضرت اسد بن زرارہؓ نے رحلت فرمائی۔

خمیازہ

مرسلہ:۔ ابن مفرح خان دل۔ مردان

ثریا، نازیہ اور بشریٰ تینوں خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھیں ...... عید میں چند ہی روز باقی تھے۔ آج ابّا جان نے وعدہ کیا تھا کہ ان کے لئے نئے نئے کپڑے اور خوبصورت سینڈل خرید کر لائیں گے۔ ان کے والد ماجد صاحب ایک سرکاری ملازم تھے۔ تنخواہ تو ان کی بہت ہی معمولی سی تھی مگر وہ اوپر کی آمدنی کے قائل تھے۔ ثریا کی امی انہیں بہت سمجھاتیں کہ وہ رشوت نہ لیا کریں مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ ثریا، نازیہ اور بشریٰ تینوں کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں مگر آج تو شاید ماجد صاحب نے نہ آنے کی قسم کھا رکھی تھی ...... جب خاصا وقت گزرنے کے بعد بھی وہ نہ آئے تو امی جان کو سخت فکر لاحق ہوئی ...... ان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگے تھے ...... وقت گزرتا گیا، امی جان

نے بچیوں کو زبردستی کھانا وغیرہ کھلا کر سلادیا۔ وہ معصوم بچیاں سوتے ہی نئے نئے کپڑوں اور سینڈلوں کے خواب دیکھنے لگی تھیں...... ماجد صاحب نے خلاف معمول آج بہت دیر کر دی تھی آنے میں...... امی جان بے اختیار ان کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگنے لگیں۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ پڑوسن کے لڑکے کو ماجد کے دفتر بھجوا دیں تاکہ پتہ تو چلے، انہوں نے اتنی دیر کیوں کردی ہے۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔ ماجد صاحب تھکے ماندے اندر داخل ہوگئے۔ آج معمول کے بالکل برعکس ان کے چہرے پر انتہائی کرب اور دکھ کے سائے لرزاں تھے۔ "خخ...... خیر تو ہے...... اتنی دیر...... اور آ۔...... آپ کچھ پریشان بھی دکھائی دے رہے ہیں...... کیا...... کچھ ہوا ہے؟" امی جان انہیں غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"آہ......" وہ سرد آہ بھر کے بولے۔......

"آج ساری عزت خاک میں مل گئی...... نورین...... میں...... میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔"

"خدا خیر کرے...... آخر ہوا کیا ہے؟" امی جان بوکھلا گئیں۔

"کاش...... میں تمہاری بات مان لیتا...... کاش!" وہ اپنی ہی رو میں بولتے چلے گئے۔ ان کی بات سن کر امی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کک...... کون سی بات؟۔"

"وہی رشوت نہ لینے والی بات...... آج...... آج میں رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ دفتر میں اتنی بے عزتی ہوئی کہ...... مجھے دھکے دے کر دفتر سے نکلوایا گیا...... وہ تو شکر کرو، باس نے پولیس کے حوالے نہ کیا، ورنہ رہی سہی عزت بھی جاتی رہتی......"

دوسری صبح نازیہ کی آنکھ کھلی تو اس کی نظر ابّا جان پر پڑی۔ وہ دوڑتی ہوئی ان کے پاس گئی اور جاتے ہی ان سے لپٹ کر نئے جوتوں اور کپڑوں کا تقاضا کرنے لگی...... اس دوران ثریا اور بشریٰ بھی جاگ چکی تھیں...... پھر بھلا وہ نازیہ سے کیوں پیچھے رہتیں۔ بے اختیار ماجد صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "میری پیاری پیاری گڑیو!۔"

"جی ابّا جان"

"تمہیں نئے کپڑے اور نئے سینڈل بہت پسند ہیں۔" "بہت...... بہت...... بہت ابّا جان......"

"اچھا ننھی شہزادیو!...... اگر تمہارا بابا تم سے معافی مانگے تو تم اسے معاف کردو گی۔؟"

"دیکھیں ابّا جان! ہم آپ کو ہر خطا پر معاف کرسکتے ہیں...... لیکن...... اگر آپ ہمارے لئے نئے سینڈل اور نئے کپڑے نہیں لائے تو ہم آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔" یہ بات ماجد صاحب کے دل میں تیر بن کر اتری تھی۔ امیّ جان نے سنا تو وہ بچیوں کو ڈانٹنے لگیں کہ وہ اپنے بابا کو تنگ نہ کریں۔ ماجد صاحب نے بچیوں سے وعدہ کیا کہ ان کی فرمائش ضرور پوری کی جائے گی۔ وہ جب تک نوکری کرتے رہے...... خوب فضول خرچی کرتے رہے مگر نوکری کے چھوٹ جانے پر اب ان کے پاس رقم برائے نام ہی رہ گئی تھی...... لیکن وہ بچیوں کے معصوم دل توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ ان کے لئے نئے کپڑے اور سینڈل لے ہی آئے...... بچیوں کے چہرے کھل اٹھے...... لیکن ماجد صاحب پریشان ہوگئے تھے۔ انہیں مستقبل کی پریشانی تھی...... آخر گزارا کیسے ہوگا؟ انہوں نے کئی جگہوں پر کوشش کی کہ کوئی باعزت نوکری مل جائے مگر ان کا پچھلا ریکارڈ ان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا...... ظاہر ہے ایک راشی کو کون نوکری دینے پر رضامند ہو سکتا تھا...... مجبور ہو کر انہوں

نے مزدوری شروع کی۔ چند ہفتوں کی مزدوری نے ہی ان پر یہ راز منکشف کیا کہ مزدوری ان جیسے کمزور جسم والے کے بس کا روگ نہیں...... وہ حد درجہ مایوسی کا شکار ہو گئے۔ اب بچیاں جب کوئی فرمائش کرتیں تو وہ ان پر غرانے لگتے۔ اب تو بچیاں انہیں دیکھتے ہی ایسے دبکنے لگتیں جیسے انہوں نے اپنے دشمن کو دیکھ لیا ہو۔ ادھر گھر کی ضروریات بھی پوری ہونے کا نام نہ لیتی تھیں لہٰذا امی جان سے بھی ہر روز جھگڑا ہونے لگا تھا۔ امی جان باحوصلہ اور صابر تھیں، خود گھروں میں جا جا کر کام کرتیں اور کسی نہ کسی طرح زندگی کی ضروریات پوری کرتی رہتیں۔ ماجد صاحب بالکل ناکارہ ہو کر رہ گئے۔ مایوسی نے انہیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ ان حالات میں اکثر لوگ منشیات کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ ماجد صاحب نے بھی یہی کیا...... رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی...... ایک دن ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی...... منشیات کے استعمال کے بعد سے وہ تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز بیمار ہو جایا کرتے تھے...... مگر اس دفعہ ان کی حالت بہت ہی عبرت ناک اور انتہائی خراب ہو گئی تھی۔ امی جان انہیں زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں اور تب ان پر انکشاف ہوا کہ وہ ہیروئن کے عادی ہیں۔ ایک دن وہ قیامت ٹوٹ ہی پڑی جس کا خدشہ تھا۔ ماجد صاحب عبرت کی تصویر بنے اس دنیا سے کوچ کر گئے...... امی جان کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا...... ماجد صاحب کی وفات کے بعد ان کا ذہنی توازن تلپٹ ہو کر رہ گیا تھا...... وہ نیم دیوانی ہو گئیں...... دن بھر یا تو قہقہے لگاتی رہتیں یا پھر کسی پتھر کے بت کی مانند خاموش رہتیں۔ ایسی خاموشی جیسے انہیں اپنی موت کا انتظار ہو اور ثریا، نازیہ، اور بشریٰ...... وہ بیچاریاں اور کیا کرتیں...... نوبت بھیک مانگنے تک آ پہنچی...... ثریا جو مسکرانے کی مشین تھی، نازیہ جو پھول کی طرح نازک تھی اور بشریٰ جو اپنی معصومانہ شرارتوں اور بے ساختہ قہقہوں کے لئے سارے محلے میں مشہور تھی، کے چہرے کسی ویران کھنڈر کی مانند ہو گئے تھے۔

بچیاں شام ڈھلے اپنی ماں کے پاس بیٹھ کر سوچتیں کہ انہیں کن گناہوں کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے؟۔ انہیں بہت یاد کرنے کے باوجود بھی اپنا کوئی گناہ یاد نہ آتا تو ان کا خیال اپنے مرحوم ابو کی طرف چلا جاتا۔ ابو کو یاد کر کے کبھی ان کے چہرے پر نفرت کے تاثرات نمایاں ہو جاتے اور کبھی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ ان کے معصوم دل ایک فیصلہ پر پہنچنے میں ناکام رہتے۔

بوجھو تو جانیں

مرسلہ۔ آصف اقبال۔ کراچی

(۱)...... وہ کونسی چیز ہے جو بندھے رہنے کے باوجود چلتی ہے؟

(۲)...... ایک گھوڑے کے آگے دو گھوڑے، ایک گھوڑے کے پیچھے دو گھوڑے۔ بتائیے کل کتنے گھوڑے ہیں؟

(۳)...... وہ کیا چیز ہے جسے پانی کے اندر کھا سکتے ہیں۔ باہر نہیں؟

(۴)...... وہ کیا چیز ہے جو شیروانی میں چھ، قمیص میں پانچ اور کرتے میں دو لگائے جاتے ہیں؟

(۵) ...... بتائیے شاہجہاں کی تاج پوشی کہاں ہوئی تھی؟

(۷) ...... کس ملک میں پان ہر شخص کو ملتا ہے؟

(۸) ...... وہ کون سی چیز ہے جس میں سے "شین" نکال دیا جائے تو باقی "م" بچتا ہے؟

جوابات

(۱) گھڑی (۲) ۳ گھوڑے (۳) غوطہ (۴) نقطے

(۵) سر پر (۶) جاپان (۷) مشین۔

اقوال زریں

ذیشان بلال ...... مانسہرہ

۱ ...... نیکی سے عمر بڑھتی ہے۔

(حضور اکرمؐ)

۲ ...... جس نے کوشش کی اس نے حاصل کیا۔

(حضور اکرمؐ)

۳ ...... اچھی کتاب بہترین دوست ہے۔

(علامہ اقبالؒ)

۴ ...... جو راستہ معلوم نہ ہو اس پر سفر مت کرو۔

(سقراط)

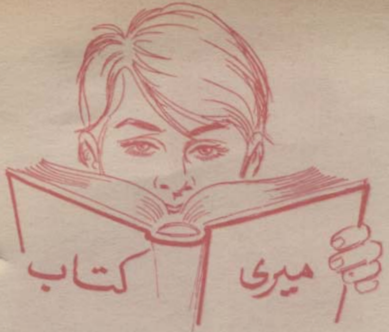

صبا سلیم

۔ نارتھ ناظم آباد ۔ کراچی

وہ دیکھو وہ رکھی ہے میری کتاب
بہت مجھ کو بھاتی ہے میری کتاب
یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ یہ کیسے ہُوا؟
یہ سب کچھ بتاتی ہے میری کتاب
جنوں اور بھوتوں کے قصّے سنائے
تبھی مجھ کو بھاتی ہے میری کتاب
محبّت، اخوّت، تمیز و ہنر
سبھی کچھ سکھاتی ہے میری کتاب

ساجد جمیل کی مئی ۱۹۹۰ء کے شمارے میں شائع ہونے والی تحریر عقلمند کسان نقل شدہ تھی۔ ان کا نام بلیک لسٹ میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ثبوت بھیجنے پر ادارہ محمد عاصم کا ممنون ہے۔

(ادارہ)

سالگرہ کے ساتھی

(ماہِ جولائی میں پیدا ہونے والے ساتھیوں کا تعارف)

سلمان نقی ، نہم اے
یکم جولائی ۱۹۷۶ء
کرکٹ کھیلنا ، سائنس
کرکٹر بننا چاہتے ہیں ۔ برنس روڈ ڈی میلو روڈ
جنید مینشن فورتھ فلور فلیٹ نمبر ۲۸ ، کراچی

عبدالباسط ، بارہویں
یکم جولائی ۱۹۷۲ء
کرکٹ کھیلنا ، اُردو ،
بزنس مین بنیں گے ۔ لائٹ ہاؤس العباس بیکری
فرسٹ فلور فلیٹ نمبر ۲ ۔ کراچی

کاشف شہزاد ، میٹرک
یکم جولائی ۱۹۷۶ء
ٹکٹیں جمع کرنا ، حساب
ڈاکٹر ۔ فلیٹ نمبر ۳ ، سبحان منزل ،
ڈی میلو روڈ ، کراچی

ڈی ۔ کے ۔ پریمی سیرورلم
یکم جولائی ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا ، قلمی دوستی
انگلش ، کرکٹر بنیں گے ۔ خانپور مہر
براستہ گھوٹکی ضلع سکھر ، (سندھ)

محمد اکمل مستقیم ، گیارہویں
یکم جولائی ۱۹۷۴ء
خدمتِ خلق ، اُردو
انسان بننا چاہتے ہیں ۔
صوفی فضل دین نزد دربار بابا امام شاہ کوٹ عثمان خان قصور

احمد علی حسرت ، ہشتم
۲ جولائی ۱۹۷۵ء
قلمی دوستی کرنا ، اردو
سماجی کارکن غریبوں اور نادلروں کی مدد کرنا ۔
الحاج سنز گرین چوک کا غذ روڈ مینگورہ ضلع سوات

مبین احمد، دسویں
۲، جولائی ۱۹۷۳ء
ٹکٹیں جمع کرنا، انگلش،
فوج میں جانا چاہتے ہیں۔ بلاک ۴ ۱۵۲ اردو ی
میٹروول نمبرا سائٹ ایریا کراچی

آفتاب عالم، کتفرہ
۶ جولائی ۱۹۷۰ء
قلمی دوستی، سندھی
انسانوں کی خدمت کریں گے۔ المنصور
بک ڈپو بس اسٹاپ، ٹنڈو باگو ضلع بدین۔

محمد حسین، ہفتم
۱۲، جولائی ۱۹۷۸ء
قلمی دوستی، سائنس،
ڈاکٹر بنیں گے۔ محمد حسین، دو شنبے
دکاندار۔ برانز بازار تربت مکران

شہاب قریشی، ہفتم
۱۳، جولائی ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا، قلمی دوستی
اُردو، انگلش، اداکار یا گلوکار
مدینہ مسجد چاکی پاڑہ مکان نمبر ۱۲، ۳۱۴ سی میرپور خاص

ہرپال کمار راجہ، دہم
جولائی ۱۹۷۴ء
آنکھ مچولی اور دیگر کتابوں
کا پڑھنا، بیالوجی، ڈاکٹر بنیں گے۔ ہرپال کمار ایچ
سی، او ہرپال کلاتھ ہاؤس نیو سبزی منڈی ٹکا تھرپارکر دکان
شاپ نمبر ۵ رابعہ روڈ

محمد حارث ادیب، گیارھویں
جولائی ۱۹۷۴ء
کرکٹ کھیلنا، مطالعہ کرنا
فزکس، انجینئر۔ ۳۱۲۔ اے بلاک ایچ
نارتھ ناظم آباد، کراچی

محمد علی عزمی، دہم
جولائی
قلمی دوستی، انگلش
ڈاکٹر بنیں گے۔ ۶۹۷/ ۲۸ عمار یاسر سوسائٹی
ملیر کالونی کراچی

ثاقب ضیاء، ہشتم
جولائی ۱۹۷۸ء
کہانیاں پڑھنا، انگلش
فوجی کمانڈر ضیاء الدین صدیقی
ہارون آباد روڈ نزد فلور مل، بہاولنگر

عبدالستار کھچی، ہفتم
جولائی ۱۹۷۶ء
قلمی دوستی، فٹ بال کھیلنا
انگلش، اچھا انسان گورنمنٹ ہائی اسکول گھارو
ضلع ٹھٹھہ۔ سندھ

○ — اس کالم میں انٹر تک کے طلباء و طالبات شریک ہو سکتے ہیں

○ — کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا

○ — خراب اور نامکمل کوپن قابلِ قبول نہ ہوں گے۔

○ — طالبات اپنی تصاویر نہ بھیجیں

"سالگرہ کے ساتھی" اپنے اختتام کو پہنچا۔ آئندہ ماہ سے ہم "قلمی دوستی" کا نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ آپ اپنا تعارف ماہِ رواں کے حوالے سے نہ بھجوائیں۔ تاہم کوپن بھجوانے کی پابندی برقرار ہے۔ کوپن صفحہ نمبر ۱۴۱ میں دیکھیں۔

کوپن کا صفحہ

آنکھ مچولی کے مختلف مقابلوں یا تحریری سلسلوں میں شرکت کے لئے جا بجا کوپن پھاڑنے سے رسالے کے بدنما ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اسی لئے تمام کوپن اس صفحے پر یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

آنکھ مچولی کی سالانہ خریداری کا کوپن

نام ــــــــــــــــ کلاس ــــــــــــــــ عمر ــــــــــــــــ

ارسال کردہ کل رقم ــــــــــــــــ بذریعہ ــــــــــــــــ دستخط ــــــــــــــــ

پتا ــ

ــ

غزل پزل میں شرکت کا کوپن

نام ــــــــــــــــ عمر ــــــــــــــــ کلاس ــــــــــــــــ

پتا ــ

جواب نمبر ۱ ــــــــ ۲ ــــــــ ۳ ــــــــ ۴ ــــــــ ۵ ــــــــ

۶ ــــــــ ۷ ــــــــ ۸ ــــــــ ۹ ــــــــ ۱۰ ــــــــ

قلمی دوستی کا کوپن

نام ــــــــــــــــ عمر ــــــــــــــــ جماعت ــــــــــــــــ

مشاغل ــــــــــــــــ پسندیدہ مضمون ــــــــــــــــ

بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ــــــــــــــــ وجہ ــــــــــــــــ

پتہ ــ

ہما سلیم

امّی ابّو کا صفحہ

غصے کو کیوں "حرام" کہا گیا ہے۔ اسی لئے نا کہ غصے میں انسان اکثر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور اسے کچھ ہوش نہیں رہتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ غصے کے عالم میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی بڑائی اور تحکم کا احساس پیدا ہوتا ہے جو تکبّر یا غرور کی ایک شکل ہے .... تکبّر تو صرف اللہ کو زیبا ہے۔ انسان کے منہ سے نکلے ہوئے تکبّر کے الفاظ شرک کے زمرے میں آتے ہیں اور شرک گناہ عظیم ہے۔

غصے کے حوالے سے جو بات ہم والدین سے کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اکثر والدین چھوٹوں پر غصہ کرنے کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ نہ صرف سمجھتے ہیں بلکہ اس حق کو اکثر و بیشتر جتاتے اور استعمال بھی کرتے ہیں۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمارے بیشتر بزرگ شدید غصے کے عالم میں چھوٹوں کی تذلیل اور انہیں رسوا کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ جن لوگوں کے سامنے یا جس ماحول میں چھوٹوں کو رسوا کیا جا رہا ہے اس میں ان کے معصوم جذبات کس قدر مجروح ہو سکتے ہیں۔ نہ ہی وہ کبھی یہ سوچنے کی زحمت کرتے ہیں کہ جس بات پر وہ اتنا برہم ہو رہے ہیں وہ بات اس قدر برہم ہونے والی ہے بھی یا نہیں۔

سبھی والدین ایک سے نہیں ہوتے مگر بہت بڑی تعداد ایسے والدین کی ضرور ہے جو اپنی پریشانیوں اور محرومیوں کا ردِ عمل چھوٹوں پر شدید غصے کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ اپنے غصے پر قابو نہ پانے والے والدین اگر یہ سطور پڑھ رہے ہیں تو جان رکھیں کہ وہ اپنے بچوں کی شخصیت کو "اعتماد" کی اس دولت سے محروم کر رہے ہیں جو زندگی کے دشوار راستوں میں ان کا زادِ راہ ہو سکتی ہے۔ آپ کا طرزِ عمل ان کے اندر جو ٹوٹ پھوٹ پیدا کر رہا ہے اس کے نتیجے میں مایوس، بے راہ رو، خود سر اور باغی اولاد تو پیدا ہو سکتی، بلند نصب العین رکھنے والی باصلاحیت اولاد نہیں۔

اور پھر آپ نے یہ بھی سوچا کہ ....

غصے کے عالم میں شرک کو چھوتی ہوئی کرخت اور متکبرانہ باتوں کے نتیجے میں آپ ایک گناہ کے بھی تو مرتکب ہو رہے ہیں۔

یاد رکھئے...... غصے کا یہ لمحہ ہی آپ کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

Every Morning
Every Night
Keep Them Healthy
Keep Them White
ACTION
JUNIOR TOOTHBRUSH
Begin your day with
ACTION...
.... and what a day it would be.
A day full of smiles, laughter
and ofcourse –healthy
gums and clean teeth.
Now
also available
at all Utility
Stores.
UNIVERSAL BRUSHWARES (PVT) LTD.

REGD. NO. M-266 July 1990

MONTHLY AANKH MICHOLLE KARACHI